جلد (۱)، نومبر ۱۹۰۵ء نمبر (۲)

ایڈیٹر
شیخ عبد القادر بی اے

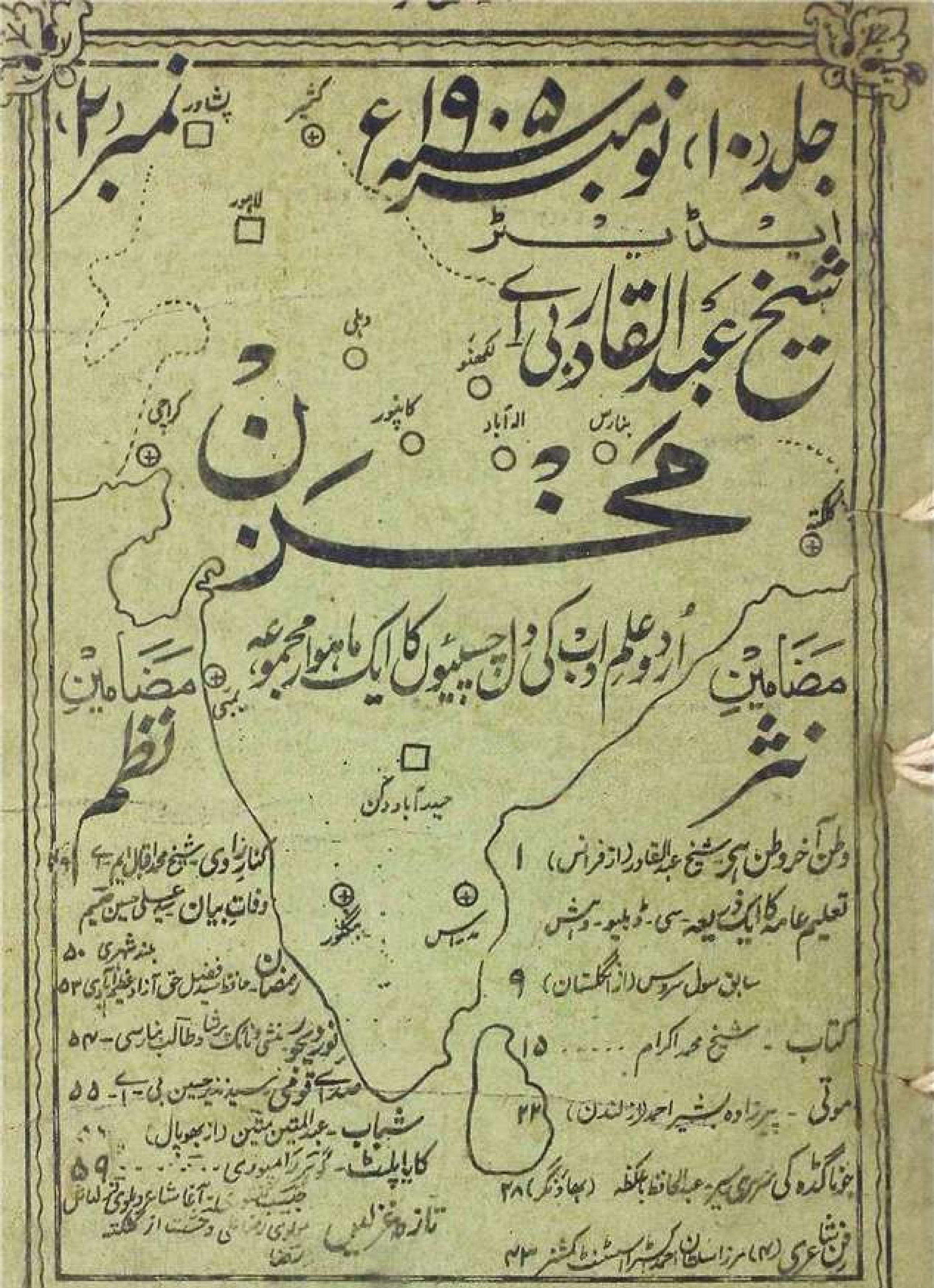

مخزن

اردو علم ادب کی دلچسپیوں کا ایک ماہوار مجموعہ

مضامین نثر

وطن آخر وطن ہی ہے - شیخ عبد القادر (از فرانس) ۱
تعلیم عامہ کا ایک ذریعہ - سی - ڈبلیو - وہش
سابق سول سروس (از انگلستان) ۹
کتاب - شیخ محمد اکرام ۱۵
موتی - پیرزادہ بشیر احمد (از لندن) ۲۲
جوناگڑھ کی سیر - عبد الحافظ بلگنظہ (بھاؤ نگر) ۲۸
فن شاعری (۲) مرزا سلطان احمد صاحب اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر ۴۳

مضامین نظم

کنار راوی - شیخ محمد اقبال ایم - اے ۴۹
وفات بیان - عشق علی حسین حکیم بلند شہری ۵۰
رمضان - حافظ سید فضل حق آزاد عظیم آبادی ۵۳
نور و ہیچو - منشی دوارکا پرشاد طالب بنارسی - ۵۴
صدائے قومی - سید منیر حسین بی - اے - ۵۵
شباب - عبد المتین متین (از بھوپال)
کایاپلٹ - گوہر رامپوری ۵۹
تازہ غزلیں
جناب آغا شاعر دہلوی جناب مولوی رضا علی وحشت از کلکتہ

لوکروڑ ہندوستانی اردو بولتے ہیں۔ اور اسی قدر اور ہندوستانی اردو سمجھتے ہیں

○ ان شہروں میں اردو مادری زبان ہے □ ان شہروں میں اردو مروج ہے ⊕ ان شہروں میں اردو سمجھی جاتی ہے۔

شیخ محمد اکرام اسسٹنٹ ایڈیٹر
نے خادم التعلیم سٹیم پریس لاہور میں چھپوا کر شائع کیا

سونے کا انڈا دینے والی مرغی

موقعہ کو ہاتھ سے نہ جانے دو

ہمارے پاس ایک مرغی ہے۔ جو تمہارے گھر جا کر ہر روز ایک سونے کا انڈا دیگی۔ یہ تمہارے گھر آنا چاہتی ہے۔ لیکن یاد رکھو۔ اگر تم غفلت کروگے۔ تو یقیناً تمہارے گھر کی بجائے یہ تمہارے ہمسائے کے گھر چلی جائیگی۔ اور وہاں جا کر سونے کا انڈا دیگی۔ یہ موقعہ ہاتھ سے جانے دو۔ اس موقعہ سے

(بتیس بیماریوں کی ایک دوا ہے)

یہ دوائی مفصلہ ذیل بیماریوں کا شرطیہ علاج ہے

(۱) ہیضہ (۳) دست (۴) پیچش (۵) کھانسی (۶) زکام (۷) جگر کی بیماریاں (۸) قولنج (بادسول) (۹) وجع العصب (۱۰) دمہ (۱۱) سرخ باد (۱۲) دائمی بدہضمی (۱۳) سردی (۱۴) سوزش حلق (۱۵) نزلہ (۱۶) خسرہ (۱۷) درد دندان (۱۸) آتشک (۱۹) درد چشم (۲۰) (۲۱) سیج (۲۲) بخار (۲۳) جل جانا (۲۴) گلے کی بیماری (۲۵) موسمی بخار۔ گرانی شکم (۲۷) پشت کا درد (۲۸) موسمی دانے پھنسیاں (۲۹) باری کا بخار (۳۰) کالی کھانسی (۳۱) دردِ کمر (۳۲) نقرس (۳۳) چوتھیہ کا بخار (۳۴) بچھو (۳۵) بھڑ (۳۶) شہد کی مکھی (۳۷) کن کھجورا (۳۸) سانپ اور ہر قسم کے زہریلے کیڑوں کے ڈنگ (۳۹) سوزش دل (۴۰) چوٹ چپٹ (۴۱) درد پسلی (۴۲) اندرونی درد (۴۳) درد معدہ (۴۴) پیٹ درد (۴۵) ہاتھ پاؤں کا پھوٹنا۔

یہ اندرونی و بیرونی دونو طرح پر استعمال کیجاتی ہے۔ جو شخص اس عجیب و غریب دوائی ہر قسم کے درد یا بیماری میں استعمال کرنے کے لئے ہمیشہ گھر میں موجود رکھتا ہے وہ سینکڑوں روپے بچا لیتا ہے۔ جو کہ اسکو دوسری حالتوں میں ڈاکٹر یا حکیم کے نذر کرنے پڑتے۔ قیمت (۱۲)

ہر قسم کے درد کا علاج

یہ دوائی ہر قسم کے درد کو خواہ سر میں یا دانت میں ہو یا جسم کے کسی اور حصہ میں ہو جڑ سے اکھاڑ دیتی ہے۔ فوراً آرام کرتی ہے۔ یہ ایسی دوائی ہے کہ جسکو درد ہو اس دوائی کو لگانے سے فوراً آرام ہو گا۔ دنیا کی کوئی دوائی اس سے اچھا نہ ہو گی۔ صرف ایک درد میں اچھا ہو جائیگا۔ (۱۲)

زکام کا علاج

یہ زکام۔ سردرد۔ آدھے سر کا درد۔ وجع العصب کا نہایت ہی علاج ہے۔ صرف سونگھنے سے ہی فوراً اور یقینی طور پر اپنا اثر پیدا کرتا ہے۔ اور مستقل طور پر مریض کو شفا دیتا ہے۔ قیمت صرف ایک روپیہ (۱۲)

مدن گوپال اینڈ کمپنی لاہور

مخزن

وطن آخر وطن ہے

(ترجمہ از فرانسیسی)

(۱)

اَنڈاےَ ڈُوڈیر مقام فلیڈلفیا کی سمتھسن کمپنی کے مشہور تجارتی کارخانے کا معتبر ملازم اپنے کمرے میں مضطربانہ پھر رہا ہے۔ اِدھر سے اُدھر جاتا ہے اور اُدھر سے اِدھر آتا ہے۔ کوئی پریشانی دامنگیر ہے۔ کبھی اپنے آپ سے باتیں کرتا ہے اور کبھی تُند و تیز حرکات سے اُس بحث کا اظہار کرتا ہے۔ جو اس کے دِل میں اندر ہی اندر جاری ہے۔

اگر اُس کے دوستوں میں سے کوئی اُسے اِس وقت دیکھے۔ تو یقیناً حیران ہو۔ کیونکہ فلیڈلفیا میں اس کے جاننے والے سب اُسے کامیاب آدمی سمجھتے ہیں اور باعثِ رشک خیال کرتے ہیں جب سے اُس نے امریکا میں قدم رکھا۔ کامیابی نے اُس کا ساتھ دیا۔ اُسے ابھی دو برس سے زیادہ یہاں نہیں گذرے۔ مگر ہر ایک کے دل میں اُس نے گھر کر لیا ہے۔ اور گو ابھی اس کی عمر چھوٹی ہے۔ تاہم اس کارخانے میں ذمہ واری کا کام اس کے سپرد ہے۔ اس بنا پر لوگ اُسے ذی فہم اور ہونہار نوجوان سمجھتے ہیں اور جانتے ہیں کہ وُہ ایک دن مالدار ہوگا۔

چند ہفتوں سے اُسے ایک اور خوش قسمتی حاصل ہے۔ سمتھسن صاحب کی بیوی نے اُسے

اپنے شام کے بے تکلف جلسوں میں آنے کا کئی بار موقعہ دیا ہے۔ اور وہاں مس ادا بلا سمتھسن اپنے پیارے پیارے ہاتھوں سے چار کی پیالیاں اُسے دیتی ہے اور اپنے لُطف آمیز تبسّم اور مہربانی کی نگاہوں سے اِس مزے کو اَور دوبالا کرتی ہے۔ چنانچہ آج قرارداد کے مطابق ان دونوں ماں بیٹیوں کے ساتھ اُسے نمائشگاہِ عام میں ہا جا سُننے جانا ہے۔ جہاں ہر قوم کے موسیقی کا نمونہ دکھایا جانے کو ہے۔ اس عزّت پر اس کے بہت سے ہمسروں کو رشک ہے۔ وُہ اس میں معنی پیدا کرتی ہیں اور گمان کرتے ہیں کہ محبت کے کرنے سے وُہ شادی کی لاٹری میں بہت سامال جیت لیجائیگا۔

بایں ہمہ اگر وہ متفکّر ہے۔ تو اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ اُسے آج ہی اپنے باپ کا ایک خط ملا ہے جس کے مضمون نے یہ اضطراب اُس کے دل میں پیدا کیا ہے۔ بوڑھا ڈُوریو ایک پنشن یافتہ فوجی کمان افسر ہے۔ جو اپنے زاد و بُوم۔ فرانس کی خدمت کے بعد وہیں ایک گانوں میں اپنے آخری دن کاٹ رہا ہے۔

آنڈرے نے کچھ عرصہ ہُوا اپنے باپ کو ایک تجویز لکھ کر بھیجی تھی۔ جس میں امریکا میں مستقل سکونت اختیار کر کے قانوناً وہیں کا باشندہ قرار دیا جانے کا ارادہ ظاہر کیا تھا۔ یہ اُس تجویز کے جواب میں ہے۔

بوڑھے سپہ سالار کے خط کا مضمون ذیل میں درج ہے :-

میرے پیارے انڈرے

جب مدرسے سے نکلتے ہی تم نے مجھے یہ کہا۔ کہ تم سپہ گری کا پیشہ اختیار کرنا نہیں چاہتے تو مَیں نے تمہاری خواہش کو تسلیم کیا۔ سپاہی ہونے کے لئے اپنے فن کا شوق اور ایثار کی خصلت درکار ہے۔ تم اس صدی کے آخری حصّے کی پیداش ہو۔ تمہارے خیالات اَور ہیں۔ اور تم نے کوئی اور ذریعہ معاش تلاش کرنا چاہا۔ پس مَیں نے مناسب نہ سمجھا کہ مَیں اپنے خیالات کی موافقت پر تمہیں مجبُور کروں۔

میں صفائی سے اِس بات کا اعتراف کرنا چاہتا ہُوں۔ کہ جب سے تم فرانس سے گئے ہو۔ تم نے

اپنے فیصلے کی عمدگی کا اپنی نمایاں کامیابی سے عملی ثبوت دیا ہے۔ اور جو خط مجھے فلیڈلفیا سے آیا ہی اُس میں تمہاری تعریف ہی آئی ہے۔

مگر اب جو تم جلدی امیر ہونے کی خاطر۔ امیر کی بیٹی بیاہنے کی غرض سے ایک دوسری قوم میں شامل ہونا چاہتے ہو اور اپنے وطن کو ترک کرنا چاہتے ہو۔ جیسا کوئی پُرانے کپڑے کو اُتار کر پھینک دیتا ہے۔ تو اَے پیارے بیٹے۔ مَیں اپنے پدرانہ اختیارات ترازو کے دُوسرے پلڑے میں ڈالنا چاہتا ہوں۔

اِس میں شک نہیں کہ تمہارے لئے پھر یورپ میں آنا باعثِ تکلیف ہوگا۔ اوّل تو تمہیں تین سال فوج میں صرف کرنے پڑینگے۔ جو ہر ایک کے لئے لابُد ہے۔ اگر وہ فرانسیسی رہنا چاہے۔ مگر فرض کا خیال مقدّم ہے اور فرض یہی حکم دیتا ہے۔ کہ تم واپس آؤ۔

جانِ پدر! وطن اُس جگہ کو نہیں کہتے جہاں معاش میسّر ہو۔ بلکہ یہ اُس سرزمین کا نام ہے جہاں والدین رہتے ہوں۔ جہاں آباؤ اجداد کی ہڈیاں مدفون ہوں۔ یا جہاں تمہارا جد رہا ہو اُسی کی خاطر تمہارا دادا دشمن کے ہاتھوں مارا گیا۔ اُسی کے واسطے مجھے لوار کی فوج میں زخمی ہونے کی عزّت حاصل ہوئی۔ آؤ اور اُس پیارے جھنڈے کے نیچے اپنی جگہ لو۔ جس نے تمہارے بزرگوار کی خون کا رنگ دیکھا ہے۔

مَیں اپنے زمانے میں خاصی ترقی کرتا رہا ہوں۔ گو مجھے کوئی بڑی مہم سپرد نہیں ہوئی لیکن میں نے اپنی زندگی کا بہترین حصّہ اپنے ملک کو دیا ہے۔ اور آڑے وقت میں اس کے کام آیا ہوں۔ اور اس وقت میں جو کچھ ہوں فرانس کی طفیل ہے۔

جب تم گھر سے نکلے تھے۔ اور مَیں نے تمہیں گلے لگا کر تمہاری پیشانی پر بوسہ دیا تھا۔ اُس وقت مَیں نے عہد کیا تھا۔ کہ تم میرے بعد اپنے ملک کی خدمت کروگے اور تمہاری نسل ہم سے بڑھ کر خوش قسمت ہوگی۔

اے فرزند! مَیں تم سے درخواست کرتا ہوں۔ اور اگر ضرورت ہو۔ تو تمہیں حکم دیتا ہُوں کہ تم فرانسیسی رہو۔ اور اپنا وطن نہ بدلو۔

کمانڈار۔ ڈُوریر"

انڈرے نے اس خط کو پھر ایک دفعہ پڑھا اور میز کے قریب آکر کانپتے ہوئے ہاتھ سے جواب لکھنا شروع کیا۔ جس کا یہ مضمون تھا:۔

میرے والدِ بزرگوار!

آپ نے لکھا ہے۔ کہ وطن اُس جگہ کو نہیں کہتے۔ جہاں معاش ہو۔ منظور! مگر کیا اس جگہ کو بھی نہیں کہتے۔ جہاں اُس کا محبوب ہو۔ میرا دل یہاں ہے۔ اور میرا کاروبار یہاں۔

مجھے فرانس جسے مَیں نے مدرسے کی کھڑکیوں سے ہی دیکھا ہے۔ اب اچھی طرح یاد بھی نہیں اور نہ مجھے اُس کا چنداں خیال ہے۔ آپ کے لئے اُس نے کیا کیا ہے۔ آپ نے اپنی ساری زندگی اس کی خدمت میں وقف کر دی۔ اور اس کے بدلے اپنا خون بہایا۔ اس کے عوض میں آپ کے کندھے پر ایک رنگدار فیتہ بڑھانے اور بڑھاپے میں محض گذارے کے موافق مدد دینے کے سوا اس نے کیا کیا۔ ملک امریکا مجھے دولتمند اور با اثر بنا دیگا۔

آباجان! مَیں اس بارے میں آپ کی حکم عدولی پر مجبور ہُوں۔ گو مجھے اس کا سخت افسوس ہے۔ مگر مَیں اپنی جوانی کے تین بیش قیمت برس گولہ باری سیکھنے میں ضائع نہیں کرنا چاہتا۔ اور جتنی جلدی ممکن ہوگا۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ کی آزاد مملکت جمہوری کے اہالی میں شامل ہو جاؤنگا۔

نوجوان انڈرے یہاں تک لکھنے پایا تھا۔ کہ ٹائیم پیس نے گھنٹی بجائی۔ اور اُسے معلوم ہوا کہ سمتھسن صاحبہ و مس سمتھسن سے ملنے کا وقت ہوگیا۔ اُس نے قلم رکھدیا اور خط ختم کئے بغیر وہ اُن کی ملاقات کے لئے گھر سے نکلا۔

۲

فرانسیسی نوجوان کا مع دو خواتین کی نمائشگاہ میں داخل ہونا باوجود مجمع کی کثرت کے لوگوں کی

نظر سے بچا نہیں۔ کئی نگاہیں اُن پر پڑیں۔ وہ خود دراز قد۔ چھریرے بدن کا۔ سیاہ مونچھیں بانکپن سے چڑھائے ہُوئے۔ فرانسیسی نسل کا ایک عُمدہ نمونہ تھا۔ اور اُس کے ساتھ والی مس ارابلا کی خوبصورت نیلگوں آنکھیں۔ نازک کمر۔ سُنہری بال اُن حسینوں کو یاد دلاتے تھے جن کے فسانے دُنیا میں گونج رہے ہیں۔

جہاں باجا بجتا تھا۔ اُس کے قریب کی کُرسیاں بالکل پُر تھیں۔ لیکن چُونکہ ان تینوں کے لئے کُرسیاں پہلے سے مخصوص ہو گئی تھیں۔ اس لئے انہیں جگہ ڈھونڈھنے میں چنداں دقت نہ ہوئی۔ گو راستے میں کسی قدر گھمسان تھا۔ خاصکر ایک جگہ جہاں ایک گروہ سفید مگر اُبھرے ہوئے گالوں والے آدمیوں کا بیٹھا تھا۔ جو آسانی سے پہچانے جا سکتے تھے۔ کہ جرمن لوگ ہیں۔

انڈرے اپنی خوش رُو جلیس کو گوشۂ چشم سے دیکھتا جاتا تھا اور اُس کے کان موسیقی سے بڑھ کر اس کی آواز کی طرف لگے ہُوئے تھے۔ کہ اتنے میں ایک عام حرکت سامعین میں ہُوئی۔ جس نے اُس کے خیالات کو جو موہومہ تصاویر کے گلابی بادلوں پر پرواز کر رہے تھے۔ زمین کی طرف دم بھر کے لئے واپس بُلا لیا۔ یعنی پیرس کی جمہوری سلطنت کے دستۂ فوج کا باجا شروع ہونے لگا۔ اچانک وہ کیا دیکھتا ہے۔ کہ وہ وردی جس کو وہ بچپن میں خوب جانتا تھا۔ اس کے سامنے موجود ہے۔ اور وہ تین رنگ کا جھنڈا جو تمام دنیا کے گرد فرانس کی شہرت اور آزادی کا آوازہ بلند کرنے کے لئے پھر چکا ہے۔ اُس کے پیش نظر ہے۔ اِن کے دیکھتے ہی وُہ سب باتیں جنہیں وہ اپنے ذہن میں بُھلا بیٹھا تھا سُرعت سے اُس کے دماغ میں پھر گئیں۔

سب لوگ سُننے کے لئے ہمہ تن گوش ہو گئے۔ ایک سکوت کا عالم تھا۔ صرف ایک آواز اِس سکوت میں مُخل تھی اور وہ ایک جرمن کی تھی۔ جو اپنے رفیقوں کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے طعن آمیزی سے ہنس رہا تھا۔ انڈرے نے سمجھا کہ وہ فرانسیسوں کے قومی جھنڈے کی ہنسی اُڑا رہا ہے۔ اُس نے بے اختیار بے سوچے سمجھے۔ پُکار کر کہا "ہُش ہُش" اور کہنے کے بعد خود اپنے آپ پر متحیر ہوا۔

باجے کے افسر نے اپنی چھڑی اُٹھائی۔ نقارے پر چوٹ پڑی۔ زنگولے بجنے لگے۔ اور موسیقی کا غیر فانی راگ کمرے میں گونج اُٹھا۔ سارا زمانہ اِس لَے کو پہچانتا ہے۔ فرانس کے مشہور انقلاب میں یہی آوازۂ جنگ تھی۔ جس نے لوگوں کے دل ہلا دیئے تھے۔ اور جب باجا ختم ہوا تو سننے والوں نے بے ساختہ داد دی۔ اور تالیوں پر تالیاں بجیں۔ مگر ایک طرف سے ایک حقارت آمیز سیٹی سُنی گئی اور یہ اسی جرمن نے بجائی۔ جسے انڈیہامے خموش رہنے کو کہہ چکا تھا۔ اِس پر فرانسیسی نوجوان بے قابو ہو گیا۔ اُسے سب کچھ بھول گیا۔ نہ یہ خیال رہا کہ اُس کی آرزوئیں کیا کیا ہیں۔ نہ یہ کہ وہ کس کے ساتھ ہے۔ یا کہاں ہے۔ غرض سب خیالات جو ابھی اِس کے دماغ میں سما رہے تھے کافور ہو گئے۔ اُسے یاد نہ رہا کہ باپ کے خط کا جواب ابھی ابھی وہ کیا لکھ رہا تھا۔ حُبِّ وطن کی کیا تحقیر کی تھی۔ اور اہل امریکا میں شامل ہونے کا اُس کا کتنا پکّا ارادہ تھا۔ یہ سب اس وقت نگاہ سے غائب تھا۔ صرف ایک چیز اُسے نظر آتی تھی اور وہ یہ کہ اُس جرمن نے فرانس کی بے عزّتی کی ہے۔ اور جیسے کوئی اپنی ماں کی بے عزّتی کے انتقام کے لئے جھنجھلا کے اُٹھتا ہے۔ اِس طرح وہ تُندی کے ساتھ اُس گستاخ جرمن کی طرف بڑھا اور جا کر اُسے گلے سے پکڑ لیا۔ تھوڑی دیر کے بعد جب ذرا حواس قائم ہوئے۔ تو اُس نے اپنے جیب سے اپنے نام کا ایک کارڈ نکالا اور اُسے اپنے حریف کو دینا چاہا۔ مگر جرمن نے اُسے لینے کے لئے ہاتھ نہ بڑھایا۔ گلا گھونٹنے سے۔ وہ پتھر کی طرح ہو گیا تھا اور اُسے اب اس فرانسیسی سے ڈوئل[1] لڑنے کی جرأت نہ تھی۔ وہ بُت بنا ہوا اُس کے مُنہ کو تک رہا تھا۔ حقارت کے ساتھ حریف کی طرف کارڈ پھینک کر فرانسیسی اُدھر کو مُڑا جہاں اُس نے دونوں خواتین کو چھوڑا تھا۔ تاکہ اُن سے معذرت چاہے کہ اُسے جوش نے اِس فعل پر مجبور کیا۔ مگر اُن کی جگہ خالی تھی۔ وہ اس بکھیڑے کی اُلجھن کے خوف سے اور اُس کی اس حرکت سے ناراض ہو کر چل دی تھیں۔

[1] ڈوئل یعنے دو آدمیوں کی لڑائی۔ فرانس اور بعض دیگر ممالک یورپ کی قدیم رسم۔ جس میں کئی جھگڑے باہمی رقابت کے اس طریق سے فیصلہ ہوتے تھے اور قانون اس رسم کو روا رکھتا تھا۔ موجودہ قوانین بہت کچھ ترمیم میں ساعی ہیں۔

۳

اِن دو امریکن عورتوں نے جو سلوک اُس سے کیا۔ اُسے دیکھ کر انڈرے کو مشہور امیر البحر نیلسن کے متعلق ایک روایت یاد آئی۔ جب نیلسن نیپلز گیا ہوا تھا تو اُس کے کسی بے تکلف دوست نے اُسے لکھ بھیجا تھا۔ "مائی لارڈ۔ انگلستان واپس آجائیے۔ اپنے ملک کی عورتوں کے تبسم کی کوئی چیز برابری نہیں کر سکتی"۔ وہ اِس بے پروائی سے بغیر کسی اظہار ہمدردی کے اُٹھ گئیں۔ اور جس چیز نے اُسے اِسی قدر رنج پہنچایا تھا۔ اُس کا اُن پر کچھ بھی اثر نہ ہوا۔ اِس سے انڈرے کو معلوم ہوا کہ فرانس اور امریکا صرف بلحاظ جغرافیہ ہی جدا نہیں۔ بلکہ دونوں کے خیالات اور عادات میں بعید فرق ہے جو کسی طرح مٹ نہیں سکتا۔

جیسے سُورج کے اثر کے سامنے دُھند اور غبار کے بادل دم بھر میں پھٹ کر بکھر جاتے ہیں اور مطلع صاف ہو جاتا ہے۔ اِسی طرح اُس کے خیالات کے بادل آناً فاناً بکھر گئے اور فرانس کی تصویر اُس کی آنکھوں میں پھر گئی۔ ہر عشق کی یہ عجب خاصیت ہے۔ کہ اِسے کبھی کبھی اِنسان مُردہ سمجھ بیٹھتا ہے۔ مگر اِس کی چنگاری راکھ کے نیچے چھپی پڑی ہوتی ہے اور اُسے بھڑکانے کے لئے ایک پھُونک کافی ہوتی ہے۔

وہی نوجوان جو اپنے آپ کو صرف کامیابی کا شائق سمجھتا تھا اور جسکی نظر میں تھوڑی دیر پہلے زر کے سوا کوئی معبود نہ تھا اب اپنی اصلیت کو صفائی سے دیکھنے لگا۔ اُس نے دیکھا کہ جس جھنڈے سے اب وہ اپنا کچھ واسطہ نہیں سمجھتا تھا۔ اُس کی خاطر ابھی ڈُوائل لڑنے پر آمادہ تھا اور اپنی جان کو خطرے میں ڈالنے کو تیار تھا۔ مرسٹی کے راگ کی آواز نے اُسے زمانہ انقلابِ فرنساوی کے سپاہیوں کا سا جوش دیدیا تھا اور خونِ حمیت اس کی رگوں میں حرکت کرنے لگا تھا۔ کیا تو وہ باپ کے غریبانہ گانوں کو حقارت سے دیکھ رہا تھا اور اُس کے جوش کے جواز کا قائل نہ تھا اور کیا ابھی ایک جرمن کی ایک ادنیٰ اسی حرکت سے کہ وہ سیٹی بجا کر فرانس کے

باجے والوں کی تحقیر چاہتا تھا۔ اُس پر حملہ کر بیٹھا۔ کیونکہ یہ تحقیر اُسے اُس مُبارک سرزمین کی تحقیر محسوس ہُوئی۔

نمائش گاہ سے نکل کر وہ اپنے گھر آیا۔ آتے ہی میز پر وُہ خط دیکھا۔ جسے وُہ ناتمام چھوڑ گیا تھا۔ اُس کو پھاڑ ڈالا۔ اور کہنے لگا:۔

پیارے باپ! فرانس کے شریف مگر منکسر خدمت گذار! تُو حق پر ہے۔ مَیں اگلے جہاز میں خط کے جواب میں خود تیری خدمت میں پہنچتا ہوں۔ اپنا بازو تیرے حوالے کرتا ہُوں۔ اور اپنے وطن کے خادموں کے درمیان جگہ دیئے جانے کی درخواست کرتا ہُوں۔"

عبدالقادر

خالق باری ایسٹ اینڈ ویسٹ

یہ کتاب امیر خسرو کی شہرۂ آفاق تصنیف کے نمونے پر لکھی گئی ہے۔ صرف فرق یہ ہے کہ بجائے فارسی کی تعلیم کے اس کا منشا انگریزی سکھانا ہے۔ لیکن ہماری رائے میں یہ تصنیف کچھ زیادہ سود مند نہیں کیونکہ کسی مناسب سلوب پر نہیں لکھی گئی۔ اور اکثر بندشس و قوافی کی ضرورتوں کے آگے صحتِ تلفظ و معنی کو بالائے طاق رکھدیا ہے۔

قیمت ——————— ۶ر

افضل المطابع پریس مرآباد سے مل سکتی ہے

تعلیمِ عامّہ کا ایک ذریعہ

میرے خیال میں ہندوستان کی تعلیم عامّہ کے لئے اس امر کی ضرورت ہے کہ کتب کا ایک معقول سلسلہ بطور نصاب تیار ہو۔ اور اُس نصاب کا ترجمہ ہندوستان کی سب زبانوں میں کیا جائے ترجمے کی غرض ملحوظ رکھنے سے نصاب کے بنانے میں بھی مدد ملیگی۔ اِس سے نصاب میں سادگی اور صحت آجائیگی اور اِس طرح وُہ انگریزی دان لوگوں کے لئے بھی اور کتابوں سے زیادہ مفید ہوگا۔ لیکن اس کا اصلی مقصد محض ان لوگوں کی خدمت ہو جو صرف مشرقی زبانیں جانتے ہیں وُہ مشرقی جو مشرقی رہنا چاہتا ہے ہماری خاص توجہ کا مستحق ہے۔ فرض کیجئے کوئی شخص زباندانی کی قوت کم رکھتا ہے اور بہت سی زبانیں حاصل نہیں کرسکتا۔ تو کیا یہ درست ہوگا کہ وہ ان خزائنِ علمی سے جو اس تعجب خیز زمانے میں جس میں ہم پیدا ہوئے ہیں آیندہ نسلوں کے لئے ایک وراثت ہیں۔ محروم رہ جائے۔ میری دانست میں ایسا ہرگز نہ ہونا چاہیئے۔ کیونکہ ان خزانوں سے مالا مال ہونے کا حق ہر ذی عقل انسان کو پیدا ہوتے ہی حاصل ہوتا ہے۔ علاوہ بریں بہت سی انگریزی درسی کتابوں کی عبارت اتنی مشکل اور پیچیدہ ہے کہ انگریزی جاننے والے بھی بسا اوقات آرزو رکھتے ہیں کہ وہ زیادہ سہل اور صاف ہوں۔ کئی مشہور کتابیں جو علم کی کان سمجھی جاتی ہیں۔ ایسی ہیں کہ ان سے طالب علم کو سونا نکالنا جس کی تلاش میں وہ محنت کر رہا ہے۔ بہت دشوار ہوتا ہے لکھنے والے تصنیف کے وقت طالب علموں کی مشکلات اور ضروریات پر کم نظر رکھتے ہیں۔ وہ اپنا شوق پُورا کرتے ہی اور اپنے علم کی نمود چاہتے ہیں۔ یا تو کسی اپنی پسند کے مسئلے کو ثابت کرنے کے لئے اِدھر اُدھر سے مفید مطلب واقعات جمع کرتے ہیں۔ بجائے اس کے کہ محض اظہارِ حق کر دیں اور بس۔ اور یا اصل بحث چھوڑ کر جزوی امور میں پڑ جاتے ہیں۔ پھر جزئیات میں ضروری اور

غیر ضروری کی تمیز بہت کم دیکھی جاتی ہے۔ اگر ضروری اور غیر ضروری تفصیل میں لوگ فرق کرنے لگے تو بہت کچھ بہتری ہو جائے۔ مگر ایسا کم ہوتا ہے اور واقعات اور سوانح اپنی قدر کے موافق ترتیب پائے ہوئے کم نظر آتے ہیں۔ اگر ایک باب بسبیلِ اعادہ لکھا جایا کرے۔ جس میں تمام مسلمہ مسائل جو کتاب میں ہیں۔ اور جو نتائج اس کے مطالعہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ درج ہوں۔ تو طلبہ کے لئے کیسی آسانی ہو۔ اگر ہر باب کی فہرستِ مضامین و مطالب اس کے شروع میں بالالتزام دیجائے اور حواشی پر مطالب کا حوالہ ہو تو بھی کتابیں زیادہ مفید بن جائیں۔ بہت سی کتابیں ایسی ہیں جن کے ساتھ انڈکس نہیں ہوتا۔ اچھا ہو اگر تعلیمی کُتب کے چھاپنے والے کوئی کتاب جو بغیر انڈکس کے ہو چھاپنی منظور نہ کریں۔ اب خواہ مصنف خود انڈکس ساتھ لگائے یا اس کی خاطر کوئی اور واقف کار آدمی چھاپنے والوں کی طرف سے اُسے تیار کرے۔

اگر ہندوستان کے تعلیمی محکموں کے لئے اس قسم کی مفید کُتب درسی کا ایک سلسلہ تیار کرنے کی کوشش کیجائے تو صرف مؤلفوں سے کام نہیں چلیگا۔ ایسی کتابوں کے تیار کرنے والوں میں علاوہ اپنے خاص مضامین کی واقفیت کے ایک اور جواہر کا ہونا ضروری ہے۔ اور وُہی شاذ ہوتا ہے یعنی یہ کہ مُبتدیوں کے لئے مضمون کو قابلِ فہم بنا سکیں۔ اس کے ساتھ زبان کی سلاست کے لئے اِس سے بھی زیادہ قابلیت درکار ہے۔ الفاظ ایسے لکھیں جن سے مطلب پُوری طرح ادا ہو اور اس کے ساتھ ہی وُہ سادگی اور اختصار کی خوبی رکھتے ہوں۔ تاکہ مقررہ حجم کے اندر کتاب تیار کر سکیں۔

مجھے اس فن میں تھوڑا سا تجربہ ہے۔ اگرچہ میں اس قسم کا کام محض شوقیہ کر رہا ہوں۔ لیکن چُونکہ میری دلی آرزو ہے کہ علوم جدیدہ کا خزانہ ہندوستان کے ہر طالبِ صادق کے لئے کھُل جائے۔ اِس واسطے مَیں اپنے تجربے سے اِس وقت کا جو پیش آتی ہے۔ بیان کر دیتا ہُوں۔ کیونکہ شاید اس سے کوئی ایسا شخص جو مطلوبہ قابلیتیں رکھتا ہو۔ فائدہ اُٹھا سکے اور اس کام کو ایسی طرح سرانجام کر سکے جیسا کہ چاہئے۔

ہندوستان کا حق میری رائے میں سائنس کی دُنیا پر اَوروں سے مقدم ہے۔ اگر یہ سچ ہے کہ آریہ نسل بنی نوع انسان کی ایسی شاخ ہے جس سے شائستگی پھیلی۔ تو یہ ظاہر ہے کہ وہ شائستگی پہلے ہندوستان کی سرزمین میں ہی ترقی پذیر ہوئی ہوگی۔ اِس خاندان کی یورپ والی شاخ نے یونان اور روما کے تمدن کے بقایا کو سمیٹ کر اپنا بنایا۔ جس سے موجودہ زمانے کی شائستگی کا ظہور ہوا۔ مگر اس میں شک نہیں کہ بحری فنون اُنہوں نے ایک اَور ہی نسل سے سیکھے۔ اور انہی فنون کی بدولت کم از کم دو ہزار سال کی جُدائی کے بعد مُدت سے بچھڑی ہوئی شاخیں پھر ایک دوسرے سے ملیں۔ پس ہر ذہین ہندوستانی طالب علم نہ صرف یہ چاہے گا کہ آریا نسل کی تاریخ میں اپنے مُلک کا صحیح درجہ معلوم کرنے کے لئے اسے اِنسانی تاریخ کے موٹے موٹے واقعات معلوم ہوں۔ بلکہ وہ یہ دریافت کرنے کی خواہش کریگا۔ کہ اس سے پہلے کیا تھا۔ اور ممکن ہے کہ اس ٹوہ میں وہ یہ بھی جاننا چاہے کہ اس سیارے پر جس کا نام زمین ہے۔ ذی حس زندگی کا آغاز سائنس والوں کے نزدیک کب سے اور کیونکر ہوا۔

گذشتہ چالیس پچاس برس میں چند نئے علوم کی ترقی اور پُرانے علوم کے متعلق نئی نئی دریافتوں سے اِنسان کی تاریخ کے بعض تاریک گوشوں پر روشنی پڑی ہے اور اس روشنی سے یہ بھی اندازہ لگایا گیا ہے۔ کہ آفتابِ تاریخ کے طلوع سے پیشتر زمین کی حالت کیا تھی۔ زمانہ قبل تاریخ پر موخر تحقیقات کے اطلاق کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ بہت سے مسئلے جو آج تک یقینی اور ثابت شدہ سمجھے جاتے تھے موہوم اور مشتبہ ہو گئے ہیں۔ اور پہلے ہی کسی مسئلے کی بابت عقائد قائم کر لینے کے خراب نتائج واضح ہو گئے ہیں۔ اب اتنی بات عام طور پر تسلیم کی جاتی ہے کہ ہر قسم کی تحقیقات کے لئے دل مثل لوحِ سادہ کے ہونا چاہئے۔ اور ابتدا میں اسی صفت کے موجود نہ ہونے کا نتیجہ یہ ہوا کہ بعض مفروضات واقعات کے رُتبے پر مانی گئیں۔

ممکن ہے کہ کوئی کہے کہ اِن نئے مسائل اور طریقوں کی اشاعت سے کیا فائدہ۔ جب

ان کا اثر منفی ہے۔ کوئی نئی چیز یقینی طور پر انسان کو دیتا نہیں۔ بلکہ بعض پرانے خیالات کی نفی کرتا ہے لیکن جس قسم کی کتابوں کی ہم آرزو رکھتے ہیں۔ اُن کے لئے یہ اصول قرار دیا جاسکتا ہے کہ تمام وہ واقعات جو قیاسی مسائل کے ناپید اکنار سمندر سے مضبوط چٹانوں کی طرح اُبھرے کھڑے ہوں۔ اُن میں جمع کئے جاویں اور ایسے واقعات ابھی اتنے کم ہیں۔ کہ اُن کو یکجا کرنا بہت مشکل نہ ہوگا اور علاوہ بریں ہمارا اصلی مقصود تو اُن کتابوں میں تاریخی زمانے کی معلومات کا جمع کرنا ہے اور اس صیغے میں سب سے بڑی دقت جو لکھنے والے کو پیش آتی ہے۔ وہ انتخابِ واقعات ہے۔ اور اس کی سخت ضرورت ہے۔ تاریخ اب بھی دلچسپ مضمون سمجھا جاتا ہے۔ لیکن تاریخ کی دلچسپی اور بھی زیادہ ہوجائے اگر اُس میں ایسے واقعات بیان کے لئے منتخب کئے جاویں۔ جن کا پائدار اثر دُنیا کی تاریخ پر پڑا ہے۔ یا جن کی وجہ سے کوئی بڑی دریافت ہوئی ہو یا کوئی بڑا اصول دُنیا میں آیا ہے جس نے بنی آدم کی حالت میں کوئی نمایاں تغیر پیدا کیا۔ مثلاً علم تاریخ میں ایسی کتاب کو جسے عام فہم ہر دلعزیز اور مفید بنانا ہو لڑائیوں اور محاصروں۔ ناموں اور تاریخوں۔ شجرۂ نسب اور خاندانی سلسلوں سے پُر کرنا ضروری نہیں۔ سوائے اس حالت کے کہ ان میں سے کسی کا کوئی اثر اہم پولیٹیکل واقعات پر پڑا ہو۔ کیونکہ ان کی وجہ سے طالب علم کی طبیعت تاریخ کے مطالعہ سے اُکتا جاتی ہے۔ اسی طرح بعض اوقات چھوٹے چھوٹے واقعات جو کتبِ تاریخ میں عموماً نظر انداز کر دیئے جاتے ہیں۔ ایسی کتاب میں قابلِ اندراج ہو سکتے ہیں۔ اگر اُن کا تعلق کسی ایسی تحریک سے ہو۔ جس سے نسل انسانی کی فلاح و بہبود متصور تھی۔

انسانی زندگی کی ابتدائی تاریخ کے مطالعہ میں جو علم سب سے پہلے کارآمد ہے وُہ علم طبقات الارض ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ ہر طالب علم اس سائنس سے گہری واقفیت حاصل کرے۔ لیکن اس کے ابتدائی مسائل پر جن سے ذی حس زندگی کے مختلف درجوں کا مختلف زمانوں میں پتہ چلتا ہے۔ حاوی ہونا ہر ایک کے لئے ضروری ہے۔ یہی علم ہے جو بتا سکتا ہے کہ کس طرح اوائل میں صرف طبقۂ اسفل

کی مخلوقات سے رُوئے زمین پُر تھا۔ اور وُہ طبقہ بڑھتے بڑھتے دودھ پلانے والے جانوروں تک پہنچا اور کس طرح یہ متواتر ارتقا کا سلسلہ آخر انسان تک پہنچا۔ مگر کہاں ہے ایسی کتاب جو انِ مختلف ازمنہ کے بیان پر ہی زور دے۔ کیونکہ عام شائقین کے لئے اسی بیان میں دلچسپی ہے۔ اور اُن جزوی تفصیلوں سے جو خاص ماہرانِ فن کے سوا ہر کسی کو تھکا دینے والی ہیں۔ پرہیز کرے؛ جتنی کتابیں عموماً اس فن میں لکھی گئی ہیں۔ سب ایسی ہیں کہ عام شائقِ علم اُن سے فوراً اُکتا جائے لیکن اگر بجائے اس کے دلچسپ حصّہ پہلے پیش کیا جائے۔ جس سے شوق بڑھ جائے تو کوئی طالب علم تکمیل کی غرض سے خود بخود جزویات اور تفصیلات کو دیکھ لینگے۔ اور وُہ اس علم کی بُنیاد کو مضبوط بنانا چاہیں گے۔ جس کے مطالعہ میں انہیں سرگرمی پیدا ہو گئی ہے۔ گویا وُہ آسان کتاب علوم و فنون کے دسترخوان پر بیٹھنے والے کو شمپین کے ایک گھونٹ کا کام دیگی۔ جس سے زیادہ مقوّی مگر دیر ہضم کھانوں کے لئے اس کی بھوک تیز ہو جائے۔ موجودہ صورت میں اس علم کی مُصطلحات تک قابلِ اصلاح ہیں۔ اور اُن سے بعض دفعہ غلط مفہوم ممکن ہے اور بعض دفعہ اصل مفہوم نہیں نکلتا۔ یہ ایک ایسا امر ہے جس کے لئے انٹرنیشنل[۱] کانفرنس علما کی جمع کرنا مفید ہو سکتا ہے۔

مصطلحات کے ذکر سے ایک اور علم کی اصطلاحوں کا خیال آگیا۔ ازمنہ قدیمہ کی تاریخ کے طلبہ جانتے ہیں کہ پُرانے لکھنے والوں نے مختلف زمانوں کو مختلف خصوصیات سے نام دیا ہے مثلاً تانبے کا زمانہ۔ پتھر کا زمانہ۔ لوہے کا زمانہ۔ لیکن اس پر اعتراض یہ ہو سکتا ہے کہ کوئی تاریخیں ایسی مقرر نہیں۔ جن کے اندر یہ خصوصیت دنیا بھر پر صادق آسکے۔ اِسی طرح اِنسان کی تمدن کے زمانوں پر غور کرتے ہُوئے اسے زمانۂ شکار۔ زمانۂ زراعت۔ یا زمانۂ حرفت میں تقسیم کر دیتے ہیں مگر ان اصطلاحات کو بدل دینا ناممکن معلوم ہوتا ہے۔ ہاں طالب علم کو چاہیئے کہ یہ اچھی طرح جان لے کہ ان تعریفوں کو مطلق تعریفیں نہ سمجھنا چاہیئے۔ بلکہ یہ ماننا چاہیئے کہ یہ محدود رقبوں سے متعلق ہیں

[۱] جس میں مختلف اقوامِ عالم شریک ہوں یا اُن کے قائم مقام موجود ہوں ۱۲

اور ہر حصّہ دُنیا کے لئے مختلف ہو سکتی ہیں۔

اِن سب دلچسپ تحقیقاتوں پر عام فہم اور سلیس کتابوں کی ضرورت نہیں - اور اگر تعلیمی محکموں کی باقاعدہ کوشش اس کے لئے ابھی تیار نہ ہو اور اس کے بیحد فوائد کو وہ نہ دیکھ سکیں تو خود اہل ملک خصوصاً اُردو دان جماعت کو چاہیے کہ قابل آدمی اس ضرورت کو پُورا کرنے کے لئے مہیا کریں +

سی - ڈبلیو - وِش (سابق سول سرجن)

لیل و نہار } حضرت طالب کے اس ڈرامے سے ہم اپنے ناظرین کو شناسائی بیشتر کرا چکے ہیں - ۲۸ - اکتوبر کی شب کو ہمیں پہلی مرتبہ اس ڈرامے کو سٹیج پر دیکھنے کا موقع ملا - لیل و نہار علمی حیثیت سے اعلےٰ پایہ کے ناٹکوں میں شمار ہونے کے قابل ہے اور اس کے مصنف کو اس پر بجا ناز ہو سکتا ہے گفتگو بالعموم چست بشستہ - بے تکلف اور بامحاورہ ہے - فقرے فقرے کی دلفریبی سامع کی توجہ کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہے - اور اپنی مافوق التوقع انوکھے پن کی وجہ سے دل پر اثر کئے بغیر نہیں رہتی - عامیانہ اور پیش پا اُفتادہ ظرافت کو چھوڑ کر ندرت و جدت سے کام لیا گیا ہے - فرسودہ فقرات لیل و نہار میں نام کو بھی نہیں - اور یہ بات بدرجہ غایت قابلِ داد ہے کہ ان علمی خوبیوں کے ساتھ اس ڈرامے میں وہ سب باتیں بھی موجود ہیں - جو ڈرامے کو سٹیج پر کامیاب بنانے میں مدد دیتی ہیں - لیل و نہار کا ہر ایک باب دلچسپ موقعوں اور سنسنی پیدا کرنے والے نظاروں سے پُر ہے - متانت و ظرافت کو پہلو بہ پہلو اس طرح نباہا ہے - کہ دونوں کی آمیزش سے ایک عجیب رنگ پیدا ہو گیا ہے - جس خوبی کا یہ ڈراما تھا اسی خوبی سے اسے سٹیج پر بھی لایا گیا - مسٹر بالی والا نے اس کھیل کی تیاری میں بہت محنت اور روپیہ صرف کیا ہے - سینری نہایت قیمتی اور عمدہ ہے اور اس عمدگی کے ساتھ اس قدر صحیح ہے کہ نقل پر اصل کا دھوکہ ہوتا ہے - علےٰ ہذا القیاس لباس بھی مناسب موقع ہونے کے علاوہ نہایت شاندار اور خوشنما تھے - پارٹس کے لینے میں بھی ذوقِ سلیم سے کام لیا گیا ہے اور ہر ایک ایکٹر کو وہی پارٹ ملا ہے جس کے لئے وہ موزون تھا - مسٹر رستم سیحنی والا نے ڈرامے کی ہیرو فیروز کا مشکل پارٹ نہایت خوش اسلوبی سے ادا کیا اور یہ کہنا کافی تعریف ہے کہ اُنہوں نے مسٹر ہرمزجی تانترا کے ایکٹنگ کا نمونہ دکھا دیا - مسٹر بالی والا نے اشرف کے بھیس میں حسبِ معمول دادِ ظرافت دی - زنانہ پارٹ میں سوسن (مس خورشید) اور دل افروز کا گانا خصوصیت سے پسند کیا گیا +

کتاب

تمام معلومہ دنیا پر (سوائے وحشی اقوام کے) کتابوں کی حکمرانی ہے۔ (وایلٹر)

خدا جانے لکھے ہوئے حروف میں کیا جادو ہے کہ ہمیشہ سے انسان کے دل میں انکی توقیر ہے اور گو اس توقیر کی صورت زمانے کی تبدیلیوں کے ساتھ بدلتی جاتی ہے لیکن اس کی اصلیت پر زمانہ کوئی اثر مخالف نہیں ڈال سکا۔ کتاب کیا ہے لکھے ہوئے حروف کا ایک بڑا مجموعہ۔ یہ حروف کیا ہیں؟ آوازیں۔ آوازیں کیا ہیں؟ انسان کے خیال کی صورتیں اور انسان کا خیال ہی وہ جوہر ہے جس کی قدر لازم ہے۔ خاصکر اس حالت میں کہ انسانوں میں سے بھی چیدہ افراد کا خیال ہو۔ جو ہمیں بہترین کتب میں ملتا ہے۔ اس لئے آدمی ہمیشہ تربیت کے لئے کتاب کی طرف دوڑتا رہا ہے اور تمام دنیا کے داناؤں نے کتب بینی کو مہذب انسان کا بہترین مشغلہ قرار دیا ہے۔ پرانے بزرگوں کے اقوال تو کتب بینی کی تائید میں مشہور ہی ہیں۔

ان لوگوں نے عمریں اس شوق کی نذر کر دیں اور پھر یہ آرزو دل میں لیگئے کہ کاش ایک عمر اور ہوتی جس میں کچھ اور پڑھتے۔ دیکھنے کے قابل یہ امر ہے کہ موجودہ زمانے میں بھی جب کاروبار کی کثرت اور مصافِ زندگی کی شدت نے لوگوں کو پریشان کر رکھا ہے۔ کتاب کے شیدائی موجود ہیں جو اس خاموش دلارام کے عشق میں ایسے ہی مست ہیں جیسے پہلے زمانے کے لوگ جنکو فرصتیں زیادہ تھیں۔ مصروفیت کی گرم بازاری شاید اور کہیں اس درجے پر نہیں جتنی ان دنوں مغربی دنیا میں ہے مگر طرفہ یہ ہے کہ کتاب کے قدردان بھی وہیں زیادہ ہیں۔ جو زمانہ طالب علمی کی کتب بینی پر اکتفا نہیں کرتے اور باوجود اہم ذمہ داریوں کے شوقِ علم تازہ رکھتے ہیں اور اپنی مثال اور نصیحت دونوں سے دوسروں کو اس شوق کی ترغیب دیتے رہتے ہیں۔

مثلاً مسٹر بالفور باوجود عہدہ وزارت انگلستان کی سخت ذمہ داریوں اور پارلیمنٹ کی مصروفیتوں کے طبقۂ فضلا میں نہایت وقعت اور اعتبار رکھتا ہے۔ اور وہ کیسا ہی کیوں مصروف ہو مطالعہ کے لئے وقت ضرور نکال لیتا ہے اور علم کے بڑھانے کی فکر سے غافل نہیں ہوتا۔ مسٹر بالفور کے خیالات کتاب کے متعلق اسکی مندرجہ ذیل رائے سے معلوم ہو سکتے ہیں:-

میری یہ قطعی رائے ہے کہ عام تشویق کے لئے علم ادب کے لُطف پر زور دینا اس کے نفع پر زور دینے سے زیادہ مفید ہے۔ میرا عقیدہ ہے کہ تمام اس قسم کے لُطف انسان کی اخلاقی اور رُوحانی ترقی میں ممد ہوتے ہیں مگر ان کی دلچسپی آدھی رہجاتی ہے اگر ہم ہر وقت ان فوائد پر نظر رکھیں جو انجامِ کار حاصل ہونگے۔ مثلاً اس سے کون انکار کرسکتا ہے کہ قدرت کے خوبصورت مناظر ہماری اخلاقی اور رُوحانی ترقی کے لئے ایسے ہی مفید ہیں جیسے علمِ ادب کی دلچسپیاں۔ لیکن جب ہم قدرتی نظاروں سے لُطف لیتے ہیں تو ہم یُوں نہیں کہتے کہ مَیں فلاں پہاڑی کی چوٹی پر چڑھنے لگا ہُوں تاکہ میری رُوح کو غذا ملے۔ بلکہ اس وقت جو تفریح اس سے حاصل ہوتی ہے اسی کا خیال زیادہ تر آتا ہے۔ ہم صرف یہی کہتے ہیں۔ مَیں نظارے کو چلا ہوں۔ میں یقین رکھتا ہُوں کہ علمِ ادب کے متعلق بھی یہی سادہ اور قدرتی طریقہ اختیار کرنا چاہیئے۔ ہر وقت علم کے لئے کوئی نہ کوئی انعام ڈھونڈھنے کی عادت (حالانکہ علم خود اپنا انعام ہے) خواہ وُہ انعام مادی صُورت اختیار کرے یا محض اخلاقی ترقی سے تعبیر کیا جائے ایک ایسی عادت ہے جس سے مجھے اتفاق نہیں۔ اگرچہ ہمارا مروجہ سلسلۂ تعلیم اس عادت کو پیدا کرتا اور بڑھاتا ہے۔ آپ یہ نہ خیال فرمادیں کہ مَیں ناممکنات کی آرزو رکھتا ہوں یا امتحانوں کے خلاف ہوں نہیں مَیں امتحانوں کو موقوف نہ کروں اگر مجھے ایسا کرنے کا اختیار بھی ہو۔ لیکن یہ کہنے سے باز نہیں رہ سکتا کہ بعض اوقات مجھے بے اختیار یہ آرزو ہوتی ہے کہ کاش آسمان نے کوئی وادیٔ علم موجودہ نسلِ انسانی کے لئے جو کثرتِ تعلیم کی ستم رسیدہ ہے۔ ایسا رکھا ہوتا جس میں رٹانے والے مدرس اور اتالیق کا قدم نہ گیا ہو اور جہاں طالب علم اپنے شوقِ جستجو میں آوارہ گردی کرسکے۔ بغیر اس کے کہ ہر خوبصورت درخت یا پھول

پر ایک لیبل لگا ہوا دیکھے اور ہر مشکل حل شدہ پائے ہر کونے کی پیمائش ہو چکی ہو اور ہر موڑ پر ایک راہبر کھڑا ہو جس کا فرضِ منصبی یہ ہو کہ مسافر کو ایک پامال رستے کا پتہ دیتا ہے مگر اس کے ساتھ ہی اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ آجکل علم کے شائقین کے لئے بہت سی آسانیاں ہیں۔ ہر شخص کے لئے خواہ وُہ بالکل طلبِ علم کے لئے وقف نہ بھی ہو یہ ممکن ہے کہ صرف اوقاتِ فرصت میں ہی معلوماتِ عامہ حاصل کرے۔ قوانینِ قدرت۔ حالاتِ تاریخ کے متعلق جو مفید ذخیرۂ علمی ہر وہ جب اس کے لئے دلچسپ ہوگا اور اس کے سوا اسے موقع ہوگا کہ گذشتہ زمانے کے قابل ترین لوگوں میں سے جسے چاہے اپنا رفیق بنا لے۔ یہ تمام حقوق جو مانگے اسے مل سکتے ہیں اور اگر ہم کتاب کے حُسن اور علم کے دل دادہ ہیں تو یہ سب کچھ ہمیں میسّر ہو سکتا ہے۔ اور جسکو یہ خوش قسمتی حاصل ہے اسے سرد و گرم زمانے سے بے پروائی ہے۔ دُنیا ہمارے موافق ہو یا مخالف ہو۔ دنیا ترقی کے پروں پر اُڑتی ہُوئی آرام و عافیت کے موعُودہ زمانے کی طرف جائے یا لاینحل عقدوں اور لاعلاج مصیبتوں سے پریشانی لائے لیکن جب تک ہمیں اچھی صحت اور اچھا کُتب خانہ میسّر ہے دُنیا بے لُطف نہیں ہو سکتی"۔

امریکہ کا مشہور مصنف ایمرسن کس زور سے کُتب بینی کے لُطف کو بیان کرتا ہے:-

"ذرا غور تو کرو چھوٹے سے چھوٹے کتب خانے میں کیا نعمت تمہارے لئے رکھی ہو۔ دُنیا میں جتنے آدمی ایک ہزار برس میں دانائی اور خوشگوئی میں مُمتاز گذرے ہیں۔ اُنہوں نے اپنے علم و دانش کے بہترین نتائج مرتب کر کے تمہارے سامنے رکھدیئے ہیں۔ اگر وُہ جیتے ہوتے تو انکی صُحبت ہمیں کہاں نصیب ہوتی۔ وُہ عموماً چھپے رہتے تھے۔ تنہائی پسند تھے۔ ملتے جلتے نہ تھے کام میں خلل گوارا نہیں کرتے تھے کہیں آدابِ مجلس اُن سے ہمکلامی کا مانع تھا کہیں وُہ خود کسی سے کلام کرتے ہوئے رُکتے تھے۔ مگر یہاں اُن کے وہ خیال جو وہ اپنے گھرے سے گہرے دوست سے بھی شاید ہی کہتے آئینہ وار تمہارے روبرو روشن الفاظ میں رکھے ہیں۔ حالانکہ تم نہ صرف

دوسرے زمانے میں ہو بلکہ اجنبی ہو ان فوائد کے لئے جو اعلیٰ عقلی عمل کا نتیجہ ہیں۔ ہم کتابوں کے ممنون ہیں۔ یہانتک کہ میرا خیال ہے کہ رُوح غیر فانی کا احساس ہمیں کتابوں ہی کی بدولت ہوا ہے"

کتاب پڑھتے ہُوئے یہ سمجھنا چاہیئے کہ جواہر عقلی کی ایک کان تک رسائی ہوگئی ہے اور جتنے جواہر سمیٹے جاسکیں سمیٹ لینے چاہیں۔ بہت لوگ ایسے ہیں جو کتاب سے سرسری آشنائی پر قناعت کر لیتے ہیں مگر پھر وُہ اس کی آشنائی سے پُورا فائدہ نہیں اُٹھا سکتے۔ اس باب میں سر آرتھر ہیلپس کی رائے بہت توجہ کے قابل ہے۔ وُہ لکھتا ہے:۔

پڑھنے کے متعلق ایک اور پہلو ہے جو باوجُودیکہ بدیہی ہے لیکن بہت اختیار کیا جاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ پڑھنے کے اثنا میں ہمیں عُمدہ عُمدہ خیالات کا جو عُمدہ الفاظ میں ظاہر کئے گئے ہوں ایک معقول ذخیرہ اپنے دل میں جمع کرتے جانا چاہیئے۔ تاکہ وہ ہر وقت ہمارے پاس ایک زندہ گنجینہ علم کے طور پر رہے اور اس سے ہم مختلف اوقات میں اور انقلابات کے موقعوں پر اطمینان اور ہمدردی حاصل کر سکیں یا اُسے اپنا رہنما بنا سکیں۔ ہر کتاب میں جو پڑھنے کے قابل ہے عموماً کچھ نہ کچھ ایسا موجُود ہوتا ہے جو صحت اور درستی کے ساتھ یاد رکھنے کے قابل بھی ہو۔ جس شخص کا دل اپنے ملک کے عُمدہ ترین اقوال کی دولت سے مالا مال ہے وہ دوسروں سے زیادہ مستغنی اور زیادہ آزاد رو ہے۔ اُس کو کُوچہ و بازار میں چلتے پھرتے زیادہ مسرّت حاصل ہوتی ہے۔ بہ نسبت اس کے جسے اس چیز سے حصّہ نہیں ملا کیونکہ داناؤں کے مشاہدے اور تجربے نے اس میں اپنے طور پر مشاہدے اور تجربے کی قوّت پیدا کر دی ہے"۔

اِنگلستان کے نامور ہیئت دان ہرشل کا قول ہے کہ جس کسی میں آپ کتاب کا شوق پیدا کر دیں اُسے آپ تمام اقوامِ دنیا کا ہم قوم اور تمام ازمنہ کا ہمعصر بنا دیتے ہیں"

ڈاکٹر ہولمس لکھتا ہے "مجھے ایک علمی حرم درکار ہے جہاں میری منظورِ نظر حسن والیاں

میری فرصت اور مرضی کی منتظر رہیں۔ میری نادر نادر کتابیں۔ میرے خوش قلم نسخے جن میں سے کئی میرے لئے دلیلہ کا حکم رکھیں اور میرا سر اپنی گود میں رکھ کے مجھے راحت پہنچائیں۔ تجھے خزانے ہوں جنکی کسی اور کو خبر نہ ہو۔ غرض کتابوں کا میں عاشق ہوں اور وہی میرے معشوق ہیں۔ اس عشق کی وجہ معقول ہو یا نہ اس سے مجھے کچھ جھگڑا نہیں یہی کافی ہے کہ میں اُن پہ مرتا ہوں اور ان کا فدائی ہونگا تا وقتیکہ موت کا ہاتھ مجھے اُن سے جُدا نہ کر دے"۔

لارڈ میکالے کا شوقِ کتاب ملاحظہ ہو ایک دوست کو لکھتا ہے:۔

"مجھ میں علم کی تشنگی اب تک باقی ہے مختلف زمانوں اور مختلف اقوام کے بڑے بڑے صاحبدلوں سے مُلاقات کا جذبہ وہی ہے۔ اپنے گرد و پیش جو کچھ موجود ہو اس سے غافل ہو کر ماضی یا مستقبل یا خیالی دُنیا میں محو ہو جانے کی قوت بدستور ہے بلکہ کتابیں میرے لئے سب چیزوں کی جا بجا ہوتی جاتی ہیں اگر اس وقت مجھے اختیار دیا جائے کہ اپنے لئے طریقِ زیست انتخاب کروں تو میں ان بڑے کُتب خانوں میں سے کسی میں جو میں نے اور تم نے اکٹھے دیکھے تھے جا بیٹھوں اور وہیں کا ہو رہوں اور کوئی گھنٹہ بیداری میں ایسا نہ گزاروں جس میں میرے سامنے کتاب نہ ہو (یعنی نیند جب آنکھ بند کر دے تو لاچاری ہے)"۔

خیر یہ درجہ تو استغراق کا ہے اور اتنا شوق نہ ہر کسی کو نصیب ہے اور نہ ہر کسی کو موافق آسکتا ہے اس کے علاوہ معمولی قویٰ کے آدمیوں کے لئے یہ ضروری ہے کہ جو کچھ پڑھیں اس کے ہضم کرنے اور اُسے اپنا بنانے کے لئے بھی انہیں وقت ملے۔ ورنہ پڑھنا بیکار چلا جاتا ہے مسٹر جان مورلے جو اس وقت نہ صرف مدبرانِ انگلستان کی صفِ اوّل میں ہیں بلکہ تحریر اور تقریر میں جا بجا بلند پایہ ہیں اور میدانِ تصنیف میں اس کا حریف مشکل سے مل سکتا ہے اس بارے میں نہایت قابل قدر نصیحت کرتے ہیں:۔

"علم ہیچ ہے اگر آپ اسے اپنا نہ بنالیں اور یہ قابلیت نہ حاصل کریں کہ موقع پہ درست حالت میں مستحضر ہو۔ گوئٹے سچ کہتا تھا کہ علم آخر اتنا ہی ہمارا ہے جتنا ہم استعمال کر سکیں۔ اور مطالعہ کا نتیجہ

جو عملی طور پر باقی رہتا ہے وُہ اسی قدر ہے اِس لئے یہ مفید ہے کہ اپنے مطالعہ میں ہم اس مقصد کو ملحوظ رکھیں - کوئی یقینی طور پر نہیں کہہ سکتا کہ کس مضمون کے متعلق خیالات اس کے ذہن نے پوری طرح اخذ کر لئے ہیں جب تک وہ انہیں اپنے الفاظ میں کاغذ پر لکھ کر نہ دیکھ لے - جب کبھی کوئی اچھی کتاب پڑھو تو یہ بہت مفید ہوگا کہ جہانتک یاد ہو بیٹھ کر اس کا خلاصہ اپنے طور پر تیار کر لو اس سے بہتر ایک اَور ترکیب ہے اگر کوئی ذرا زیادہ محنت برداشت کرنے پر آمادہ ہو یعنی وہ کام کرے جو لارڈ وسٹ لیفورڈ گبن اور وبسٹر کرتے تھے وُہ پہلے کتاب کا نام - مضمون اور ڈھانچ دیکھ کر قلم اُٹھا لیتے تھے اور اپنے ذہن سے لکھنے کی کوشش کرتے تھے کہ اس میں کیا کیا مسائل ہونگے اور ان کے متعلق کیا رائے ہوگی - کس قسم کی اطّلاع بہم پہنچائی گئی ہوگی - اس قسم کی مشق سے فائدہ یہ ہوتا ہے کہ پڑھتے وقت صرف آنکھ ہی صفحہ پر عبور نہیں کرتی جاتی بلکہ جو نیا علم حاصل ہو اس کا مقابلہ پہلی معلومات سے ہوتا جاتا ہے اور دونوں معلومات اپنی اپنی جگہ دماغ میں لیتی جاتی ہیں -

اچھی کتاب کو دو دفعہ پڑھنا ہمیشہ مفید ہوتا ہے - اِس احتیاط سے غرض یہ ہوتی ہے کہ اخذ کرتے وقت کوئی چیز گر نہ گئی ہو کسی مسئلے کو غلط طور پر نہ سمجھ لیا ہو یا اس کے غلط معنے نہ لگا لئے ہوں اگر مضمون زیادہ دقیق ہے تو ایک دفعہ پڑھنے کے بعد کچھ وقفہ کر کے دوبارہ پڑھنا زیادہ مناسب ہوتا ہے - اس کی مثال خساندے کی ہے - مصفا عرق حاصل کرنے کے لئے کچھ دیر اسے دل میں بھگو رکھنے کی ضرورت ہے - جو چیز پہلے مبہم اور پیچیدہ معلوم ہوتی تھی وُہ تھوڑی دیر غور و فکر کے بعد صاف ہو جاتی ہے جو دوائیاں بھگوتے وقت پانی کو گدلا سا کر دیتی تھیں ان سے نتھرا ہوا زلال نکل آتا ہے "

کتابوں کی تعریف میں مشاہیرِ عہد کی شیوا بیانی کے مزے لیتے ہوئے اس زمانے میں کتابوں کی کثرت کا خیال بھی ضرور آتا ہے اور اس میں شک نہیں کہ ان دنوں اس شوق کے ساتھ احتیاط کی ضرورت پیدا ہو گئی ہے عُمدہ نظرِ انتخاب درکار ہے ورنہ نہ تو کتاب کا پورا فائدہ

ملتا ہے اور نہ بہترین کتابوں سے واقفیت ہوتی ہے - حالانکہ وقت اور روپیہ بیدریغ کتاب کی نذر ہو چلتا ہے -

شوپن ھور مشہور جرمن فلسفی کیا خوب کہتا ہے :- کتابیں خریدنا بہت اچھا ہوتا ہے - اگر آدمی اُن کے پڑھنے کے لئے وقت بھی خرید سکتا - آجکل اکثر ایسا ہوتا ہے کہ لوگ کتاب کے خریدنے کو غلطی سے اُنکے علم کی تحصیل سمجھ لیتے ہیں "

کتاب کا شوق اور اس شوق کے ساتھ اس سے فائدہ اُٹھانے کی لیاقت اور ہمت اور اچھی کتابیں چننے کا سلیقہ ہو تو کتب خانہ ایک بہشت جاودانی ہے جیسا کہ سر جان لببک نے جس کی نظرِ انتخاب کی شہرت ہے کہا ہے :" کتب خانے کو اگر ہم اس کا ہم درست استعمال کریں تو رُوئے زمین پر سچ مچ کا فردوس بنا سکتے ہیں - ایسا باغ عدن جس میں وہ ایک رکاوٹ بھی نہ ہو جو اصل باغ عدن میں تھی - کیونکہ یہاں ہمیں ہر میوہ کھانے کی اجازت ہے خصوصاً درختِ علم کا پھل - جس کے کھانے کی بدولت کہتے ہیں ہماری مادر اولین کو بہشت سے نکلنا پڑا تھا "

اکرام

شہد کی مکھی کے حالات :- یہ کتاب پنجاب ریلیجس بک سائیٹی کے مفید معلومات کی سلسلے میں ایک قابلِ قدر اضافہ ہے - اس کتاب میں شہد کی مکھیوں کا تاریخی بیان ان کے اقسام اور مختلف نام ان کے کام ترکیب جسمانی ان کے جسمانی اور دماغی قوا ان کے جذبات اور ولولے اور جو مفید سبق انکی زندگی سے لوگوں کو حاصل ہوتے ہیں اور ان کے مفصل حالات با تصویر درج ہیں - چھپائی عمدہ کاغذ ولائتی حجم ۱۲۲ صفحہ بقیمت ۸ ؍ اسسٹنٹ سیکرٹری پنجاب ریلیجس بک سوسائٹی لاھور سے مل سکتی ہے -

موتی

ہائے! میرا موتی! شاہزادیوں کی زینت کے قابل۔ خالص سونے میں نزاکت سے جڑا ہوا جس کا ثانی میں دعویٰ سے کہہ سکتا ہوں مشرقی سمندروں میں نہ تھا۔ میرا موتی۔ گول۔ بے بہا۔ طرح دار جس کو میں سب جواہرات پر فوقیت دیتا تھا۔ افسوس وہ نادر موتی مجھ سے باغ میں گھاس پر گر پڑا اور گرتے ہی زمین اُسکو نگل گئی۔ صد افسوس میری محنت کی کمائی لُٹ گئی۔ اور میں اُس کے غم میں گُھٹ رہا ہوں۔

اُس دن سے میرا یہ معمول ہوگیا کہ میں موتی کے گم ہوجانے کے مقام پر منڈلایا کرتا تھا۔ اور اس کی جستجو میں جو غموں کو مجھ سے دُور رکھتا سرگرداں رہتا تھا۔

ایک دن یہ سانحۂ دلگداز میرے دِل کے ٹکڑے کر رہا تھا اور میرے سینے میں غم کی آگ بھڑکا رہا تھا۔ کہ اچانک ایک رسیلا راگ میرے کانوں میں پہنچا۔ جس کی آواز پہلے کبھی میرے کان نے نہ سُنی تھی۔

راگ کا سُنائی دینا تھا کہ مختلف خیالات کا لشکر میرے دِل پر ٹوٹ پڑا اور اس نے میرے حاک میں ملے ہوئے موتی کو یاد دلا دیا۔ اور میں کہنے لگا:۔ او زمین! تو نے میری خوشی کا سامان غارت کر دیا۔ اور بے مثل موتی کو نگل لیا۔ مگر یاد رکھ جہاں وُہ خزینہ پنہاں ہے وہاں خوشبودار جھاڑیاں سایہ کرینگی۔ اور اُن جھاڑیوں پر سفید۔ نیلے۔ پیلے پھول کھلیں گے۔ اور آفتاب کی روشنی میں مثل چاندی سونے کے چمکینگے۔ میوے اور پھول اُس کی نواح میں ہرگز نہیں مُرجھائینگے۔ جب ایک مُردہ بیج سے اس قدر اناج پیدا ہوتا ہے کہ زمیندار اپنے گھر بھر لیتے ہیں تو غور کر کہ اس بیش قیمت بیج سے کیا کیا نہ پیدا ہوگا۔ اچھوں کے نتیجے اچھے ہی ہوتے ہیں۔

میرے موتی سے میرے خیال میں خوشبودار پھول پیدا ہونگے۔

اِسی طرح ایک زمانہ گذر گیا۔ ایک دن مَیں باغ میں تھا۔ اگست کا مہینہ تھا۔ فصل کٹ رہی تھے۔ جونہی میں اپنے موتی کے گم ہو جانے کی جگہ پہنچا۔ تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہاں خوشبودار جھاڑیاں کھڑی ہیں اور جس قدر وہ خوبصورت تھیں اُسی قدر اُن سے خوشبو کی لپٹیں آتی تھیں۔ تب مجھے خیال آیا کہ یہ سب میرے موتی کی کرامات ہے۔

مَیں مصروفِ نظارہ تھا کہ غم و فکر کا پھر غلبہ ہوا اور میرا دل گھبرانے لگا۔ ایک آواز آئی کہ صبر۔ مگر صبر کہاں مَیں تو موتی کی یاد میں دیوانہ تھا۔ مجھ پر بیہوشی طاری ہوئی اور غش کھا کر میں گھاس کے ہرے ہرے بچھونے پر گر پڑا۔ گرتے ہی میرا دماغ خوشبو سے معطّر ہو گیا۔ اور مَیں ایک خواب دیکھنے لگا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ میری رُوح پرواز کر گئی اور میرا جسم خاکی اس ڈھیر پر پڑا رہ گیا۔ میری رُوح اسرارِ الٰہی کے معلوم کرنے میں مشغول تھی کہ مَیں ایک پہاڑ کی چوٹی پر جا چڑھا۔ سامنے سبز جنگل نمودار تھا جس کے گرد چٹانیں تھیں ان چٹانوں سے ایک طرح کی چمک پیدا ہوتی تھی جس کا کوئی انسان اندازہ نہیں لگا سکتا کیونکہ آدمی نے کبھی اس سے آدھی خوبصورت چیز بھی نہیں دیکھی۔

پہاڑیوں کی چوٹیاں بلور کی تھیں۔ درختوں کا رنگ نیلگوں تھا۔ ٹہنیوں پر گھنے پتے نکھری ہوئی چاندنی کی طرح چمک رہے تھے۔ ہر بادل نے اُنکی چمک کو دوبالا کر دیا تھا۔ وہاں کی کنکریاں موتیوں سے نسبت رکھتی تھیں اور آفتاب اُنکی ضو سے شرماتا تھا۔

اِن عجیب اور خوبصورت پہاڑیوں کے نظارے میں مَیں اپنا غم و فکر بھول گیا۔ وہاں کے میوے بھوک کو دو چند کرنے والے تھے۔ مختلف رنگوں کے پرندے جھنڈوں میں اُڑ رہے تھے۔ کوئی شاعر اُنکی خوشی کا اندازہ نہیں بتلا سکتا۔ اُن کے پروں میں سے باجے کی آواز آتی تھی اور وہ باجہ ہر ایک کو مست کرتا تھا۔

اِسی مستی میں مَیں آگے بڑھا چلا گیا۔ اور بلند پہاڑیوں پر بلا دقت چڑھ گیا۔ جس قدر اس جنگل

میں آگے کو بڑھتا تھا۔ میری حیرانگی زیادہ ہوتی جاتی تھی۔ آخر میں ایک دریا کے کنارے پر پہنچا۔ اس کے کنارے مصالحہ کے درختوں سے سجے ہوئے تھے۔ جن کی مہک دماغ کو تازگی بخشتی تھی دریا کی کیفیت کیا بیان کروں اُس کے بہنے سے ایک راگ پیدا ہوتا تھا۔ اس کی تہ میں چمکیلے سنگریزے تھے جو چمک دمک میں ستاروں سے مشابہ تھے۔ اور ہر ایک سنگریزہ جو اُس ندی کے تہ میں تھا۔ زمرد۔ ہیرے اور لعل سے مشابہت رکھتا تھا۔ اور انکی چمک اس قدر تھی کہ دریا تختۂ روشنی بنا ہوا تھا۔

(۱۱) سبز میدانوں۔ دریاؤں۔ جنگلوں۔ گھاٹیوں اور سبز پہاڑیوں کے نور نے میرے تن میں نئی رُوح پھونک دی اور میرے دردِ دل کو گھٹا دیا۔ میرے غموں کو مجھ سے دُور ہٹا دیا۔ اور میری تکلیفوں کو رفع کر دیا دریا کے کنارے کنارے میں خوش خوش پھر رہا تھا۔ اور باغ باغ ہو رہا تھا۔ جوں جوں میں آگے بڑھتا تھا میرا غنچۂ دل کھلا جاتا تھا۔ اس سے بھی زیادہ الوانِ نعمت وہاں تھے جنکے بیان سے میں قاصر ہوں۔ کیونکہ آدمی جو خاک کا بنا ہوا ہے اُس نعمتِ عظمےٰ کا دسواں حصہ بھی نہیں سمجھ سکتا۔ ان نظاروں اور دلچسپیوں نے مجھے کامل یقین دلا دیا کہ دریا کے اس پار بہشت واقع ہے۔ میں نے خیال کیا کہ یہ ندی جادو سے بھری ہوئی ہے۔

ندی کے پرے کنارے پر میری نظر جمی رہی اور بہت دیر تک میں اُسی حالت میں رہا۔ اگرچہ وہ جگہ بھی جہاں میں اسوقت تھا انتخابِ روزگار تھی مگر دریا کے پار اس سے لاکھ گنے زیادہ خوبصورت اور دل کو لبھانے والے نظارے تھے۔ میں ٹھہر گیا۔ اِدھر اُدھر نظر ڈالی کہ کہیں پایاب پانی مل جائے تو اُس پار چلا جاؤں۔ مگر جوں جوں آگے قدم اُٹھاتا تھا راستہ کٹھن ہوتا جاتا تھا مگر میرا حوصلہ بڑھا ہوا تھا۔ میں نے خیال کیا کہ کوئی خطرہ نہیں مجھے اپنے ارادے سے باز نہیں رکھ سکتا میں نے پانی کے دوسرے کنارے پر پہاڑ کی بلورین چوٹی کے سائے میں ایک خوش وضع خوبصورت لڑکی کو دیکھا۔ اس کی پوشاک سرتاپا نورانی تھی۔

خالص سونے کی طرح وہ نُور پہاڑی کے دامن میں چمک رہا تھا۔ اور میری نظر دیر تک اس نظارے سے ہٹ نہ سکی - یہ بھی معلوم ہوتا تھا کہ مَیں اسے پہچانتا ہوں۔ اور ڈر بھی لگتا تھا کہ کہیں دھوکا ہی نہ ہو۔ شوق نے مجبور کیا کہ نام لیکر پکاروں مگر حیرانگی میرے دِل پر ایسی غالب آئی - کہ یہ جرأت نہ ہوسکی وہ ایسی جگہ بیٹھی تھی کہ دل اس جگہ کے دیکھنے کی تاب نہیں رکھتا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد اُس نے اپنا خوبصورت چہرہ اوپر کو اُٹھایا۔ میری نگاہ کا اُسکی نگاہ سے ملنا تھا کہ میرا دل کانپ اُٹھا۔ میری آنکھ خیرہ ہوگئی اور زیادہ ٹھہرنا میرے لئے خوف کا باعث معلوم ہُوا۔ میرا مُنہہ بند تھا اور میری آنکھیں کُھلی ہُوئی تھیں۔ اسی اثنا میں وُہ کانِ خوبی اپنی شاہانہ پوشاک میں ملبوس اُٹھی - اسکی پوشاک موتیوں سے لدی ہُوئی تھی اور اُن بے بہا موتیوں کو دیکھنا عجب لُطف رکھتا تھا۔ مَیں نے کبھی ایسے موتی نہیں دیکھے تھے۔ اُس کے کُرتے کی آستینیں چوڑی تھیں اور ان کے حلقوں پر دوہری موتیوں کی جھالر لٹکتی تھی۔ اس کے سر پر موتیوں کا تاج تھا اور سوائے موتی کے اَور کسی طرح کا زیور اسکی زینت میں دخل نہیں رکھتا تھا۔

انجام کار خوش نصیبی سے وہ پہاڑی کے دامن سے دریا کی طرف خراماں ہُوئی۔ مَیں اس کے نظارے میں محو تھا۔ اس نے ایک دلربا انداز سے جس میں زنانہ عفت اور حیا جلوہ گر تھے۔ میری طرف دیکھا اور اپنے تاج کو سر سے اُٹھا کر اس نے مجھے سلام کیا۔ تب تو میری بھی ہمت بندھ گئی اور مَیں یُوں گویا ہُوا۔ ”اَے موتی! موتیوں سے بھرپُور - موتیوں کی کان - کیا تو میرا گم شدہ موتی ہے؟ ہائے جب سے تو اس باغ میں غائب ہوا تھا میرے لئے کھانا پینا حرام ہوگیا۔ دُنیا آنکھوں میں اندھیر تھی۔ اور ہر وقت تیرے فراق میں آنکھوں سے آنسوؤں کا تار جاری رہتا تھا۔

اَے میرے پیارے موتی!! انصاف تو کر کہ مَیں یُوں تیرے فراق میں بے قرار رہوں

اور تو سیر بہشت کے مزے اُڑائے"۔ اس سوال سے وہ پری زاد کسی قدر برہم ہوئی اور جواب دیا۔ کہ گذشتہ ماجرے کے دُہرانے سے کیا حاصل۔ کیا آپ کے لئے یہ کافی خوشی نہیں کہ آپ کا موتی ایسے باغ میں جو خوشی اور عیش کا وطن ہے (ہمیشہ کے لئے متمکّن ہوگیا ہے) اور اگر آپ واقعی اپنے موتی سے اِس قدر محبّت رکھتے ہیں تو اس سے بہتر جگہ اس کی رہائش کے لئے اور کونسی چاہتے ہیں۔

آپ کے موتی کی مثال ایک گلاب کے پُھول کی ہے جو قدرت کے حکم سے کبھی مُرجھاتا ہے اور کبھی کھلتا ہے۔ کبھی زیرِ زمیں چھپ جاتا ہے اور کبھی سنگ و بولیکر زمین سے نکلتا اور آنکھوں کو تازگی بخشتا ہے۔ جس کا نام آپ مرجھانا۔ گرنا اور گم ہو جانا رکھتے ہیں وُہ صرف تبدیلیٔ مکان ہے۔ پھر اس کا غم کیا۔ آپ کا موتی یہاں پہنچکر ایک بے بہا دُر ہوگیا ہے۔ آپ خواہ مخواہ ناشکری کرتے ہیں۔ کہ تقدیر نے آپ کے موتی کو آپ سے جُدا کر دیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو اپنے موتی سے پُوری محبت نہیں ہے۔

جب وہ موتیوں کی پتلی جسکی ملاقات خود موتی کے ملنے سے کم نہ تھی اور جس کے الفاظ موتیوں سے گراں قیمت تھے۔ اپنی تقریر ختم کر چکی۔ تو مَیں نے کہا۔ "اَے بابرکت موتی مَیں معافی کا خواستگار ہُوں۔ تو نے میرا غم غلط کر دیا۔ مَیں خیال کیا کرتا تھا۔ کہ میرا موتی بیجان ہوگیا ہے مگر اب تو مَیں نے اپنے موتی کو خوش نصیبی سے پالیا ہے اور اب مَیں اس کو اچھی طرح حفاظت سے رکھونگا۔ اور اس کے ساتھ اپنی زندگی جو غموں اور فکروں کا شکار ہو رہی تھی۔ اس گلشن بے خار میں مزے سے گذارونگا۔ اور اُس جنابِ باری کا شکریہ ادا کرتا رہونگا۔ جس نے میرے موتی کو مجھ سے ملا دیا ہے۔ مگر مَیں اس کنارے پر ہُوں اور تو اُس کنارے پر ہے ہائے کیا اچھا ہوتا کہ دریا کی لہریں ہمارے درمیان نہ ہوتیں اور مَیں اور تم ایک جگہ ہوتے"۔ تب اُس نے کہا کہ "اَے گرفتارِ محبت! عقل سے کام لے۔ تیری تقریر میں تین باتیں ایسی ہیں۔ جنہیں سُنکر مجھے بے اختیار

ہنسی آئی - تو نے اوّل تو یہ کہا کہ گم شدہ موتی کو پالیا ہے - دُوسرے میرے ساتھ رہنے کی آرزو ظاہر کی اور تیسرے اس ندی کے پار ہو کے میرے پاس آنا چاہتا ہے - سو پہلی بات غلط ہے اور دُوسری دونوں ناممکن - پہلے اپنے آپ میں موتی کی سی آب اور صفائی پیدا کر اور پھر اُس کی ہمنشینی کا دم بھرنا - مَیں اُس جوہری کو بیوقوف سمجھتی ہُوں جو اپنے اُوپر حد سے زیادہ بھروسا رکھے - جوہر کی آب و تاب پہچاننے سے پہلے اپنی حقیقت کے پہچاننے کی قوت حاصل کر“

(ترجمہ)

بشیر احمد (از لندن)

لیکے دل وُہ چھیڑ سے کچھ کہ گیا — دیکھتے کا دیکھتا مَیں رہ گیا
مَیں نہ کہتا تھا کہ دل لے لو مرا — عاقبت وہ خون ہو کر بہ گیا
چاند سے چہرے پہ کیوں ڈالی نقاب — چاند یہ کیسا گہن میں گہ گیا
اس قدر گردش میں تھا میرا غبار — ساتھ پھر کر آسماں رہ رہ گیا
گالیاں بھی جھڑکیاں بھی تم نے دیں — اور دینے کے لئے کیا رہ گیا
مجھ کو جو سننا تھا مَیں نے سُن لیا — اُس کو جو کہنا تھا منہہ پر کہ گیا
ہائے میری خستگی و ماندگی — چل دیا سب قافلہ مَیں رہ گیا
اور ناصح کو کڑی مَیں نے کہی — ایک جب چبھتی ہوئی وُہ سہ گیا
جب سے وُہ رہنے لگے ہیں بے نقاب — روز و شب کا نُورِ مہر و مہ گیا
عاشقوں سے عشق چھپتا ہے کہیں — پھوٹ کر جب روئے دریا بہ گیا
داغ سے اُٹھا نہ اک رشکِ رقیب — جو ستم سہنے کے تھے وہ سہ گیا

داغ (فصیح الملک)

جوناگڈھ کی ہر بری سیر

اکثر ایسا اتفاق ہوتا ہے کہ جس شے کی طرف دل مائل ہوتا ہے اُس کے حصول میں ضرور کسی نہ کسی قسم کی رُکاوٹیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اور اُن رکاوٹوں کا پیدا ہو جانا لُطف سے خالی بھی نہیں کیونکہ جس دن سے ایک چیز کی خواہش دل میں پیدا ہوتی ہے اُسی دن سے اُس چیز کے حاصل ہو جانے تک درمیانی زمانے کا ہر ایک دن انتظار میں کٹتا ہے اور یہ انتظار اُس چیز کی قدر دوبالا کر دیتا ہے۔ پھر وہ انتظار کتنا ہی طُول کیوں نہ کھینچے شوق میں کمی نہیں ہونے پاتی بلکہ وہ شوق روز بروز بڑھتا ہی چلا جاتا ہے اور عجب مزہ دیتا ہے۔ مگر جہاں اُس چیز پر دسترس ہو گئی۔ تھوڑی مدت میں اس سے سیری ہو جاتی ہے اور پھر وہ آرزو۔ وہ ولولہ باقی نہیں رہتا جو اس کے ملنے سے پہلے تھا۔

جو مزہ انتظار میں پایا
نہ کبھی وصلِ یار میں پایا

جوناگڈھ کے شوقِ دید میں میری بھی یہی کیفیت تھی۔ جب سے کاٹھیاواڑ میں قدم رکھا اُسی دن سے اس شہر کے دیکھنے کا شوق دل میں جاگزین ہوا۔ ایک تو پُرانا تاریخی شہر دُوسری کاٹھیاواڑی ریاستوں میں درجہ اول کی ریاست کا پائے تخت اور سب سے بڑھ کر دلبستگی کی وجہ یہ کہ ریاستِ اسلامی۔ چھ برس تک تو یہ آرزو دل کی دل ہی میں رہی لیکن کوئی موقعہ اس عروسِ کاٹھیاواڑ کے دیکھنے کا ہاتھ نہ آیا۔ میری کاٹھیاواڑی زندگی کے پہلے برس کے اندر ہی اندر البتہ اس شہر کے بالکل قریب سے ریل پر دو چار دفعہ میرا گذر ہوا۔ اور اس شہر کی جو جھلک اُس وقت دُور سے نظر آئی اُس نے شوقِ دید کو میرے دل میں اور گدگدا دیا لیکن چند روز قیام کرکے اس شہر کے دیکھنے کا اتفاق مجھے گذشتہ ماہ جُون ہی میں ہوا۔

آٹھویں جون پنجشنبے کی شام کو سات بجے بھاؤنگر سے ریل پر سوار ہوا اور کوئی دس بجے دھولا جنکشن پر پہنچا - رات بھر یہاں ٹھہرنا پڑا - کیونکہ ریل یہاں بدلتی ہے - ویٹنگ روم (اُتارِ انتظار) مسافروں سے بھرا ہوا تھا لیکن صبح جانے والی ٹرین اسٹیشن پر کھڑی تھی - اُسی میں بستر لگا کر سو رہا - صبح نو بجے ریل روانہ ہوئی تو اُسی خانے (کمپارٹمنٹ) میں جس میں میں بیٹھا ہوا تھا دو مرہٹے بھی آ بیٹھے - یہ بہاؤالدین کالج کے پروفیسر تھے - دونوں گریجویٹ تھے اس لئے اُنکی علمی لیاقت تو اعلیٰ درجے ہی کی ہونی چاہیئے لیکن ظاہری وجاہت ایسی نہیں تھی کہ جس سے طلبا مرعوب یا گرویدہ ہو سکیں - میرا مشاہدہ سطحی تھا اِس لئے اُن کے اخلاق و اطوار کے متعلق میں زیادہ وضاحت سے بحث نہیں کر سکتا - جو کچھ میری نگاہِ ظاہر بین نے دیکھا میں نے لکھ دیا -

جیتلسر پر ریل پھر بدلنی پڑی - ہمارے مرہٹے ساتھی کسی اَور خانے میں جا بیٹھے اور اب کے ایک گوانیز صاحب کا ساتھ ہوا جو بہاؤالدین کالج کے فرنچ کے پروفیسر تھے - چونکہ دسویں جون کو گرمیوں کی تعطیل کے بعد بہاؤالدین کالج کھلنے والا تھا - اِس لئے یہ پروفیسر اپنے اپنے گھروں سے لوٹ رہے تھے - سہ پہر کو میں جوناگڈھ پہنچ گیا اور اسٹیشن کے قریب ہی مسافری بنگلے میں قیام کیا -

جیسا کہ ریاستوں میں قاعدہ ہوا کرتا ہے کہ وقتاً فوقتاً ترسیلِ تحایف سے باہمی ارتباط و اتحاد کا اظہار کیا جاتا ہے - مہاراجہ صاحب بھاؤنگر نے بھی مجھے چند تحایف دیکر نواب صاحب جوناگڈھ کی خدمت میں مزاج پرسی کے لئے بھیجا تھا - جو خدمت مجھے سپرد ہوئی تھی اُس کے بجا لانے کے لئے کچھ زیادہ وقت درکار نہیں تھا لیکن ریاستوں کا یہ بھی دستور ہے کہ ایسے مہمان کو جلد رخصت نہیں کر دیتے اِس لئے جوناگڈھ میں اٹھارہ دن ٹھہرنے کا مجھے موقعہ ملا اور اس اثنا میں قریباً کُل قابلِ دید مقامات کی میں نے سیر کی - مراسمِ مہمان نوازی بایں شائستہ ادا کئے گئے اور مجھے بڑا آرام ملا -

ملک کا ٹھیاواڑ زیادہ تر مسطح ہے اور اس ملک میں پہاڑ بہت کم ہیں - پہاڑیوں کے جو دو چار

چھوٹے چھوٹے سلسلے اس مُلک میں ہیں اُن میں گرنار سب سے زیادہ بلند اور زیادہ مشہور ہے اِسی سلسلے کے غرب میں جوناگڈھ واقع ہے اور دامنِ کوہ میں آباد ہونے کی وجہ سے اس شہر کا منظر زیادہ خوشنما بنگیا ہے۔ ریل جوناگڈھ کی مغربی حد کے قریب سے گذرتی ہے اور شہر کا مجموعی نظارہ بھی ریل ہی سے خُوب نظر آتا ہے۔ اسٹیشن کے مقابل نصف دائرے کی شکل میں ایک عمارت بنی ہُوئی ہے جو بہاؤالدین بلڈنگ کہلاتی ہے۔ اِس عمارت کے وسط میں شہر کا خوبصُورت داخلہ ہے اور اس داخلے پر ایک چار رُخی گھڑی لگی ہوئی ہے۔ داخلے سے جنوباً شمالاً فصیلِ شہر چلی گئی ہے۔ جو بہت پُرانی نہیں دکھائی دیتی فصیل مضبوط ہے نہ خوبصُورت۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ فصیل غنیم کے مقابلے کے لئے نہیں بنائی گئی بلکہ اہلِ شہر کو چوروں۔ ڈاکوؤں اور درندوں سے محفوظ رکھنے کے لئے بنی ہے۔ نہ گولی اور تیر چلانے کے لئے اس میں عمُودی تنگ رخنے بنے ہُوئے ہیں۔ نہ کنگرے ہیں۔ بعد کی متواتر مرمّتوں نے اس فصیل کی یہ ظاہری صُورت بنا دی ہے ورنہ فی الحقیقت گجرات[۵۱] کے سُلطان محمود بیگڑے نے ۱۴۷۲ء میں پہلے پہل اس کو تعمیر کرایا تھا اور فوجدار میرزا عیسیٰ ترخان کے زمانے (۱۶۳۳ء سے ۱۶۴۲ء تک) میں از سرِ نو اس کی مرمّت ہوئی تھی۔ داخلے کی دائیں جانب شہر پناہ کے اندر نوّابانِ سلف کے مقبرے اور جامع مسجد ہے۔ مسجد اور مقبروں کے چھوٹے بڑے گنبدوں اور مختلف الوضع میناروں کے مجمُوعے نے کھجُور اور ناریل اور قسم قسم کے درختوں کے جھُنڈ میں ایک عجیب اور دلفریب مشرقی نظارہ پیدا کر دیا ہے جس کے دیکھنے سے سیری نہیں ہوتی۔ اِن مقبروں کے پیچھے شہر کے پختہ مکانات نظر آتے ہیں۔ اور زمین ڈھلوان ہونے کی وجہ سے ہر عقبی مکان اگلے مکان سے بلند تر نظر آتا ہے۔ نگاہ ان مکانوں کے زینے کو جب ختم کر لیتی ہے تو دربار اور محلسرا کی عالیشان عمارتوں پر جا کر ٹھہرتی ہے اور

[۵۱] بمبئی گزیٹیر جلد ہشتم مطبوعہ ۱۸۸۴ء صفحہ ۴۸۰ و صفحہ ۵۰۱۔

اِن عمارتوں کی پُشت پر گرنار کی بلند چوٹیاں حدِ نظر بن جاتی ہیں۔

یہ بیان تو شہر کے اس عام نظارے کا ہے جو بیرون شہر سے دکھائی دیتا ہے۔ لیکن جب شہر میں داخل ہوتے ہیں تو اس نظارے کی دلفریبی بہت کچھ کم ہو جاتی ہے۔ راستے تنگ اور پیچیدہ ہیں۔ مکانات گو پُختہ ہیں مگر سوائے عامّہ کے ایسے مکان شاذ ہیں جن کا روکار یا درشن حُسنِ تعمیر رکھتا ہو۔ تاہم ان تنگ اور ٹیڑھی ترچھی گلیوں میں ایک مشرقی دلاویزی ہی جو اُن میں گشت لگانے والے کے دل پر ایک خاص اثر کرتی ہے۔

ولیعہد بہادر کے محل کے سامنے ہلالی یا نصف دائرے کی شکل میں پُختہ دُکانوں کی ایک قطار بنی ہوئی ہے۔ جو مہابت سرکل کہلاتی ہے۔ اور اس قطار کے دونوں سروں پر دو پُختہ محرابیں بنی ہیں۔ ان محرابوں سے نکل کر شمال اور جنوب کو ایک راستہ چلا گیا ہے جس پر تھوڑے فاصلے تک دورویہ دوکانیں ہیں۔ یہی یہاں کا بازار ہے اور شام سے کچھ پہلے اس بازار میں ایک چکّر لگائیں تو جوناگڈھیوں کے ہر طبقے اور ہر درجے کے لوگوں کی مختلف حالتیں ایک ہی نگاہ میں نظر آجاتی ہیں۔ بعض بلند بالا اشخاص ایسے نظر آتے ہیں جن کے سینے چوڑے بازو بھرے بھرے اور مضبوط ہوتے ہیں اور ان کے ہر عضو میں مردانہ تناسب پایا جاتا ہی۔ ان کے سنجیدہ چہروں سے جلال برستا ہے اور ان کی چال سے استقلال نمایاں ہوتا ہے۔ لباس بھی ان کا سادہ اور سپاہیانہ ہوتا ہے اور اس میں کوئی چیز نمائشی نہیں ہوتی۔ ہاں۔ ایک شمشیرِ خوش غلاف گلے میں حمائل ہوتی ہے۔ یہ صُورتیں یادگار ہیں اس شجیع افغانی اور بہادر بابی[1] نسل کی جس نے اس ملک میں ریاست کی بُنیاد ڈالی۔ کثرت اُن رنگیلے اور سجیلے نوجوانوں کی ہوتی ہے جن کی ہر طرز سے زنانہ پن اور ہر ادا سے عیش پرستی ظاہر ہوتی ہے۔ ان کی انگرکھے

---

[1] یہ نسبت اس مذہبی فرقے کی طرف منسوب نہیں ہی جو ایران میں موجود ہی۔ شاہانِ دہلی کی ڈیوڑھی کی پاسبانی یا بوابی غالباً اس کی وجہ تسمیہ ہی ۱۲

باریک ململ کے ہوتے ہیں جن کے چاک کمر تک کٹے ہوتے ہیں اور دامن پھریروں کی طرح آگے پیچھے اُڑ کر جسم کے حصّہ زیرین کی بے ستری کرتے ہیں - اُن کی رانین اور پنڈلیاں تنگ مہری کے چوڑی دار چُست اور پھنسے ہوئے پاجامے میں محبوس ہوتی ہیں - سر پر شوخ رنگ کی پگڑی ہوتی ہے - انگے کے بند زرّین یا طلسی صدری کے دکھانے کے لئے کھلے رکھے جاتے ہیں - سر پر پٹے یا انگریزی طرز کے آگے کے بال ہوئے تو پٹیاں جمائی جاتی ہیں ورنہ بالوں کا ایک گچھا تو ضرور پیشانی پر پگڑی سے باہر نکال دیا جاتا ہے - ہونٹ پان کی سُرخی سے لال - آنکھوں میں سُرمے کی تحریر - گلے میں سونے کی کنٹھی - پانوں میں چاندی کی بیڑی یا توڑا - یہ بھی انہیں بابیوں کی دوغلی اولاد ہے جو کاٹھیاواڑی ادنیٰ قوموں کے میل جول سے پیدا ہوئی ہے اور اُنکے ننگ و ناموس کو برباد کرنے والی ہے - ان کے علاوہ ہندوؤں میں ناگر برہمن - نئے بقال مُسلمانوں میں عرب - پنجابی - وغیرہم بہت سی قوموں کے افراد دکھائی دیتے ہیں جن کے بیان سے مضمون میں طوالت پیدا کرنے کے سوا کچھ حاصل نہیں -

جوناگڈھ کی خصوصیتوں میں ایک یہ خصوصیت دیکھی کہ شاہراہوں پر بخلاف اَور کاٹھیاواڑی شہروں کے عورتیں بہت کم نظر آئیں - اگر کہیں دیکھی بھی گئیں تو یا وہ عورتیں دیکھی گئیں جن کی شکستہ حالی ظاہر کرتی تھی کہ وہ بہت ہی غریب ہیں اور سودے سلف کے لئے بمجبوری باہر نکلی ہیں یا وہ چڑیل شکل بازاری عورتیں جن کے لئے جوناگڈھ بدنام ہے - نہیں معلوم وہ کیسے گندہ مزاج - دیوسیرت اشخاص ہونگے جو ان کریہ منظر غلیظ عورتوں کو پسند کرتے ہیں ! ہندو عورتیں بھی باہر نکلتی ہوئی کم دیکھی گئیں یا اگر کوئی نکلتی بھی ہیں تو کسی معزز شخص کی گاڑی سامنے سے آتی دیکھ کر فوراً گھونگھٹ نکال پیٹھ پھیر کر کھڑی ہو جاتی ہیں اور جب تک وہ گاڑی نکل نہیں جاتی ہے آگے نہیں چلتیں - اس ظاہری پردے کی سخت پابندی کی دو وجہیں ہونی چاہئیں - ایک تو اسلامی ریاست کا پُرانا رواج - دوسرے بد اطوار اشخاص کی

کثرت سے ننگ و ناموس کے غیر محفوظ ہونے کا خوف۔

مردوں کا لباس ضمناً پہلے بیان ہو چکا ہے۔ عورتیں تنگ مہری کا پائجامہ اور "پیشواز"[1] پہنتی ہیں اور سر پر دوپٹہ یا اوڑھنی اوڑھتی ہیں بعض پیشواز کے عوض کرتنی پہنتی ہیں اور کم سن لڑکیوں کو قبا بھی پہنائی جاتی ہے۔

یہاں کا سکّہ کوری ہے جو چونّی کے برابر چاندی کا ایک سکّہ ہے۔

قدامت کے لحاظ سے جو مقامات تاریخی دلچسپی رکھتے ہیں اُن میں کوہ گرنار اوّل درجے پر ہے۔ ایک روز علی الصّباح ہم ٹٹوؤں پر سوار ہو کر گرنار دیکھنے کے لئے اپنی قیام گاہ سے نکلے۔ جس بنگلے میں مَیں ٹھہرا ہُوا تھا اسی میں ایک یوروپین سوداگر بھی مقیم تھا۔ جب اس کو معلوم ہُوا کہ میں گرنار دیکھنے کے لئے جاتا ہُوں تو وُہ بھی ساتھ چلنے پر آمادہ ہُوا اور چونکہ وہ ایک زندہ دل شخص تھا اس کی رفاقت نے تنہائی کی بے لُطفی کو بھی دُور کر دیا۔ ایک ہندو صاحب بھی بطور رہبر کے ہمراہ تھے اور ملازموں کو ملا کر ہم چھ آدمیوں کی ایک چھوٹی سی جماعت بنگئی تھی۔ شہر کے مشرقی دروازے سے باہر نکلتے ہی چپّے چپّے پر بعض مندر یا تالاب۔ یا پل یا کُنڈ ایسے ملتے ہیں کہ جن کے ساتھ ضرور کوئی نہ کوئی تاریخی واقعہ منسوب ہے بلکہ بعض مقامات ایسے بھی ہیں جن کے متعلق تاریخی زمانے سے پیشتر کے قصّے اور فسانے مشہور ہیں۔ شہر سے وہ مقام جہاں سے پہاڑ کی چڑھائی شروع ہوتی ہے دو ڈھائی میل کے فاصلے پر ہے اور جو سڑک اس فاصلے کو طے کرتی ہے وہ چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں اور ٹیلوں کے درمیان لہراتی ہوئی ایک پُرجلال کوہستانی منظر سے گذرتی ہے اور اس قدرتی منظر کو بعض پُرانے کھنڈروں اور گرنار سے نکلی ہوئی ندی پر بنے ہُوئے پختہ پُل نے زیادہ دلکش بنا دیا ہے۔ اثنائے راہ میں ایک نو تعمیر پختہ حُجرہ بھی ملتا ہے جس میں قدیم زمانے کی سنگین تختیاں رکھی ہُوئی ہیں۔ ان تختیوں پر اشوکا وغیرہ کے کتبے کندہ ہیں۔ ہندوؤں کا مرگھٹ بھی

[1] یہاں گھگرے یا لہنگے کو کہتے ہیں ۱۲

اِسی راستے پر ہے۔ جب ہم گھر سے نکلے تھے تو ابر کی وجہ سے گرنار نظروں سے بالکل غائب تھا۔ اگر ہم نے اس کو اگلے دن اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لیا ہوتا تو اس کے اس قدر قریب موجود ہونے کے کبھی قائل نہ ہوتے۔ جُوں جُوں ہم پہاڑ سے نزدیک ہوتے گئے کہر کا پردہ آہستہ آہستہ اُٹھتا گیا اور جب اس کے دامن میں پہنچے تو گرنار اپنی پُوری عظمت و جلال میں دکھائی دینے لگا۔

ابتدائے فراز سے قُلّہ کوہ تک پُختہ زینے بنے ہوئے ہیں اور شاید کل ہندوستان میں یہی ایک اکیلا مقام ہے جہاں ۳۶۶۶ فیٹ کی بلندی پُختہ زینوں کے ذریعے طے کی جاتی ہو۔ ہماری لئے ریاست کی جانب سے ڈولیوں اور کُرسیوں کا پہلے ہی سے انتظام کر دیا گیا تھا اِس لئے چڑھائی میں نہ ہم تھکے اور نہ ہمیں کسی قسم کی تکلیف محسُوس ہُوئی۔ لیکن پہاڑ پر بغیر زینوں کے پاپیادہ چڑھنے کا جو لطف ہے وہ ہمیں میسّر نہیں ہوا۔ اکثر پہاڑوں میں نصف بلندی یا کچھ زیادہ طے کرنے کے بعد ایک مسطح مقام ملتا ہے جو کمرِ کوہ کہلاتا ہے۔ گرنار میں یہ مقام منتہائے بلندی سے اس قدر قریب ہے کہ اس کو سینۂ کوہ کہنا زیادہ مناسب ہے۔ اسی مقام پر جینیوں کے متعدّد مندر ہیں جن کے وسط میں بائیسویں ترتھنکار۔ نمی ناتھ کا بڑا مندر ہے۔ حسنِ تعمیر کے لحاظ سے ان میں کوئی خصوصیت نہیں ہے اور ستون اور چھت وغیرہ پر جو نقش و نگار کندہ کئے گئے ہیں وہ بھی چُونکہ پتّھر نرم استعمال کیا گیا ہے امتدادِ زمانہ اور حوادثاتِ موسم سے شکست و ریخت ہو گئے ہیں اور پھر چونے کی استرکاری اور قلعی نے ان کو اَور بھی بدنما بنا دیا ہے۔ نمی ناتھ کے مندر کے اردگرد پُختہ صحن ہے اور اس صحن کے حاشیے پر ایک جالیدار غلام گردش بنی ہوئی ہے۔ اِس غلام گردش میں سنگ سفید کے بہت سارے بُت رکھے ہُوئے ہیں۔ ہر بُت کی آنکھوں میں نگینے جڑے ہیں اور پیشانی پر بھی ایک ایک نگینہ لگا ہے۔ ایک بُت ایک تہ خانے میں بٹھایا ہُوا ہے۔ اس تہ خانے میں گھی کے چراغ جلا کر اُترتے ہیں۔ تہ خانہ نہایت تنگ و تاریک ہے اِس لئے بند ہُوا اور چراغوں کی بُو سے دم گھُٹنے لگتا ہے۔ ہم ان مندروں کی سیر کر ہی رہے تھے کہ پوجا کا وقت آن پہنچا اور نمی ناتھ کے مندر میں پجاری جمع

ہونے شروع ہوئے۔ کُل پجاریوں کا لباس یکساں اور یک رنگ تھا۔ ایک دھوتی کمر میں بندھی ہوئی تھی اور ایک چادر کندھوں پر اس طرح لپیٹی تھی کہ اس کا ایک سرا چہرے کے حصہ زیرین کو ڈھنکے ہوئے تھا تاکہ ناک اور مُنہ کے راستے اجرام ہوائی داخل ہو کر ہلاک نہ ہو جائیں۔ ہر دھوتی اور چادر کا رنگ زعفرانی یا زرد تھا۔ پجاری تو سب کے سب دھیان گیان میں مشغول خاموش تھے لیکن ایک شخص جو معمولی کپڑے پہنے ہوئے تھا پجاریوں کے درمیان کھڑا ہُوا بہ آوازِ بلند چیخ رہا تھا "پہلی پُوجا کے ۔۔۔ چودہ آنے"۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ یہاں ہر روز ہر پوجا کا نیلام ہوتا ہے اور سب سے زیادہ بولی بولنے والے پجاری کو پہلی پُوجا کا موقعہ دیا جاتا ہے۔ گو اس طریقے سے مندروں کے سرمایہ میں ایک معقول اضافہ ہوتا ہے لیکن مندر کو منڈی بنانا اور وہاں عبادت کی تجارت کرنا میرے خیال میں نہایت نامناسب ہے۔

اِن مندروں سے جانبِ شمال تھوڑے فاصلے پر ایک بہت بڑی مدوّر چٹان ہے جو بھیرو جَپ یا بھیرو جو کہلاتی ہے۔ اگلے زمانے کے خوش اعتقاد ہندو اِس چٹان سے گر کر خودکشی کرنی کو ذریعۂ نجات سمجھتے تھے مگر اب اس کلجگ کے زمانے میں اس دروازے سے سُرگباشی ہونا کوئی پسند نہیں کرتا۔

اس مقام کی سیر کرنے کے بعد ہم پہاڑ کی پہلی چوٹی پر گئے جہاں انبا ماتا کا مندر ہے۔ اس چوٹی سے شہر اور نواحِ شہر کا سرسری نظارہ بہت صاف دکھائی دیتا ہے۔ جانبِ مشرق ایک ہی خطِ مستقیم میں دو اور چوٹیاں ہیں اور اُن پر پہنچنے کے لئے بھی زینے بنے ہوئے ہیں۔ ایک چوٹی سے دُوسری چوٹی پر جانے کے لئے کچھ زینے اُتر کر پھر چڑھنا پڑتا ہے۔ درمیانی چوٹی۔ جو گورکھ ناتھ کہلاتی ہے۔ تمام چوٹیوں سے زیادہ اونچی ہے اور اس پر بھی ایک مندر بنا ہوا ہے۔ ہم یہاں تک آئے لیکن اس سے آگے تیسری چوٹی پر نہیں گئے۔ کیونکہ درمیانی نشیب و فراز بھی دشوار گذار تھا اور مندر کے سوائے اور کوئی چیز بھی وہاں دیکھنے کے قابل نہیں تھی ہمیں اُمید تھی کہ ان چوٹیوں پر

پہنچ کر دوسری جانب ہمیں "گر" جنگل نظر آئیگا لیکن بعوض جنگل کے میدان دکھائی دیا۔ گر اور گرنار ان دو ناموں کی مماثلت سے ہمیں یہ خیال پیدا ہوا تھا۔ جب ہم نے لوگوں سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ وہ جنگل یہاں سے چند میل دور ہے۔ کہتے ہیں "گر" ہی تمام ہندوستان میں ایسا جنگل ہے جہاں شیر ببر پائے جاتے ہیں۔

مسلمانوں نے جب دیکھا کہ ہندوؤں نے تو اچھی اونچی جگہ اپنے تیرتھ کے لئے مقرر کرلی ہے اور ہم ہی پھسڈی رہے جاتے ہیں تو انہوں نے بھی ایک بلند پہاڑی ڈھونڈھ نکالی جس پر کسی مندر کا قبضہ نہیں ہوا تھا اور وہیں آسن جما کر اپنی بھی زیارت گاہ قائم کرلی۔ اور گرنار کے مقابلے میں داتار اس کا نام رکھا۔ یہ پہاڑی گرنار کے سلسلے میں جانب جنوب و مغرب واقع ہے۔ یہاں بھی پختہ زینے بنے ہوئے ہیں۔ ہمارے ہندو بھائیوں نے تو لاٹری قائم کرکے اس کی آمدنی سے گرنار کے زینے بنائے تھے اور یہاں ریاست کا ہزار ہا روپیہ برباد ہوا ہے۔

ایک روز شام کو حسبِ معمول تفریح کے لئے میں باہر نکلا۔ گاڑی کوہِ داتار کے دامن کی طرف جا نکلی اور یکایک میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ چلو آج داتار ہی کی سیر کریں۔ وقت بہت تنگ تھا اور ڈولیوں کا بھی بندوبست نہیں تھا اس لئے میں نے تو ذرا تامل کیا لیکن ایک ہندو صاحب میرے ہمراہ تھے انہوں نے یہ کہہ کر کہ چڑھائی کچھ زیادہ نہیں ہے مجھے چلنے پر آمادہ کیا۔ چڑھائی کم ہونے کے متعلق ہمارا اندازہ غلط ثابت ہوا اور داتار کے مقام تک پہنچنے میں پورا ایک گھنٹہ لگا۔ اثنائے راہ میں کچھ پختہ حجرے ملے تھے۔ ہم تو انہیں کو مزار سمجھ کر خوش ہوتے تھے کہ چلو پہنچ گئے۔ لیکن جب یہ معلوم ہوا کہ یہ تو حضرت کے خلیفہ کی عبادت گاہ ہے تو دل بیٹھ گیا اور بعد کی چڑھائی گھسٹتے گھسٹتے طے کی۔ خلیفہ صاحب کی عبادت گاہ کو وہاں کے مجاور حضرت کے وزیر کا مقام کہتے تھے۔ جب ہم منزلِ مقصود کو پہنچے ہیں تو شام ہو چکی تھی اور نوبت بج رہی تھی دروازے کے باہر ایک پختہ چبوترے پر چند مجاور سادھوؤں کی شکل بنائے۔ ننگے۔ صرف لنگوٹیاں

باندھے - نہایت میلی کچیلی حالت میں گانجے کی چلموں کے دم لگا رہے تھے - دروازے سے اندر داخل ہوکر ایک مختصر سا صحن ہے اور مقابل میں ایک غار کا مُنہہ دکھائی دیتا ہے - مَیں سمجھتا تھا کہ اس غار میں کسی بزرگ کی قبر ہوگی اس لئے صحن ہی میں کھڑے کھڑے فاتحہ پڑھ لیا لیکن جب غار میں داخل ہوا تو وہاں قبر کا پتہ نہ پایا - غار چھوٹا اور تنگ تھا - کوئی دو گز چوڑا اور چار پانچ گز لمبا ہوگا - بلندی اس قدر کم کہ بحالتِ رکوع اندر داخل ہونا پڑتا ہے - منتہائے غار پر کچھ آرائشی اشیا - چند شترِ مُرغ کے انڈے لٹک رہے تھے - ایک پندرہ سولہ برس کا لڑکا - کالا بھجنگا - دوزانو بیٹھا عود و لوبان کی دھونی مار رہا تھا - بند ہوا اور دھوئیں کے مارے میرا تو دم گھُٹنے لگا فوراً پچھلے پاؤں باہر نکل آیا - دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ غار تو صرف داتار کا مسکن ہے یہ کسی کو معلوم نہیں کہ وہاں کہاں مدفون ہیں - عوام کا اعتقاد ہے کہ رات کو کبھی کبھی داتار اِن پہاڑیوں میں گشت لگاتے ہُوئے نظر آجاتے ہیں - جب ہم پہاڑ سے اُترنے لگے تو شفق کا اُجالا زائل ہو چکا تھا لیکن اچھا ہُوا کہ رات چاندنی تھی ورنہ موذی جانوروں کا خوف ضرور تھا

اب مَیں اُس پُرانے قلعے کا بیان کرتا ہوں جسکی وجہ سے غالباً یہ شہر جوناگڈھ مشہور ہُوا موجودہ شہر سے یہ قلعہ جانبِ شمال مشرق واقع ہے - اور چونکہ ایک پہاڑی پر تعمیر ہوا ہے یہاں کے لوگ اس کو "اُپر کوٹ" کہتے ہیں - قلعہ کے اندر تمام عمارتیں منہدم ہوگئی ہیں صرف ایک مسجد باقی ہے اور وہ بھی انہدام پذیر ہے - گنبدوں کے عوض چھت میں بڑے بڑے گول روشندان بن گئے ہیں اور جو ستُون گنبدوں کو تھامے ہُوئے تھے وہ بھی ٹوٹ گئے ہیں - صاحبِ گزیٹیر اس مسجد کا بانی محمود بیگڑے کو ٹھہراتا ہے لیکن میرے خیال میں یہ عمارت دراصل مندر کی ہے - ہاں سلطان محمُود نے قلعہ فتح کرنے کے بعد مندر کو مسجد بنا دیا ہوگا - یہ نتیجہ میں نے اس طرح استنباط کیا ہے کہ عمارت تمام پتھر کی ہے لیکن منبر اینٹ اور چونے سے بنا ہے اور ہے بھی بالکل غیر موزوں - علاوہ بریں مغربی دیوار میں بعوض ایک

محراب کے تین محرابیں بنی ہیں - اور ان محرابوں کی نقاشی میں زنجیروں سے لٹکتے گھنٹے کندہ ہیں جو مندروں کے نقشے کی ایک خصوصیت ہے - محرابوں کی انتہائی بلندی پر بعض ٹوٹی ہوئی چھوٹی چھوٹی تصویروں کے آثار بھی پائے جاتے ہیں -

مسجد کے پہلو میں دو توپیں پڑی ہیں - جن میں ایک بہت بڑی ہے اور نیلم توپ کہلاتی ہے - یہ توپ طول میں سترہ فیٹ ہے اور اس کے پچھلے حصہ کا محیط ساڑھے سات فیٹ اور منہ کا قطر ساڑھے نو انچ ہے - ترک اس توپ کو دیو[1] میں چھوڑ گئے تھے اور بحکم سلطان بہادر شاہ ملک ایاز نے اس کو جوناگڈھ پہنچایا تھا - اس کی پشت پر خوشخط اور صاف ابھرے ہوئے حرفوں میں بخطِ نسخ ایک طغرا بنا ہے جس میں لکھا ہے کہ اس توپ کا بنانے والا سلطان سلیمان بن سلیم خان کے عہد میں محمد حمزہ نام ایک شخص تھا -

اس قلعے میں دو کنوئیں بھی بہت عمیق ہیں اور پانی کی سطح بھی ان میں بہت نیچی ہے - ایک میں اترنے کے لئے جو زینے بنے ہیں وہ عجیب ہیں - کنوئیں کے منہ سے جب اندر جھانکیں تو ایک سیدھی چار دیواری کھڑی نظر آتی ہے لیکن اس چار دیواری کے گرد اگرد پہاڑی کاٹ کر زینے بنائے گئے ہیں - تھوڑے تھوڑے فاصلے پر کنوئیں کی چار دیواری میں دریچے بھی بنا دیئے گئے ہیں تاکہ زینوں پر روشنی اور ہوا پہنچے مگر دریچے اس غرض کو پورا نہیں کرتے - ہاں زینوں سے اترنے والا دریچوں سے سر نکال کر سطح آب یا آسمان کو دیکھ سکتا ہے -

فی الحال اس قلعے کے اندر بہت بڑے پختہ حوض تیار ہو رہے ہیں جو میٹھے پانی کے خزانوں کا کام دینگے اور نلوں کے ذریعے یہاں سے شہر میں پانی پہنچایا گیا ہے -

زمانہ حال کی عمارات عامہ کا بیان اگر تفصیل کے ساتھ علیحدہ علیحدہ لکھا جائے تو مضمون بہت لمبا ہو جائیگا اس لئے ان کے متعلق چند اشارے کرنے ہی پر اکتفا کرتا ہوں -

---

[1] دیو ایک جزیرہ ہے جو جنوب میں ساحل کاٹھیاواڑ کے قریب واقع ہے اور پرتگیزوں کے قبضے میں ہے ۱۲

بہاؤالدین کالج کی عمارت بڑی عالیشان ہے اور اس کا ہال نہایت وسیع ہے۔ کل علاقہ بمبئی میں اس ہال کی وسعت رکھنے والے ہال بہت کم ہونگے اور کاٹھیاواڑ میں تو یقینی ایک بھی نہیں۔ کالج کے متعلق جو رسیڈنسی (بورڈنگ ہوس) ہے اس کے کمروں کی قطاریں بھی خوبصورت بنی ہیں۔ کمروں کی دونوں جانب برآمدہ ہے اور ہر کمرے میں ضروری فرنیچر مثلاً میز۔ کرسی۔ پلنگ۔ الماری وغیرہ بھی مہیا ہے۔ کاٹھیاواڑ میں جھولے کا بہت رواج ہے اس وجہ سے طلباء کی آسائش کے لئے ہر کمرے کے ساتھ برآمدے میں ایک ایک جھولا بھی لٹکتا ہے۔ پروفیسروں کے لئے بھی چھوٹے چھوٹے بنگلے بنے ہوئے ہیں اور پرنسپل صاحب کا بنگلہ تو بہت ہی اچھا ہے۔ بنگلوں اور کمروں کے سامنے چمن بھی آراستہ کئے جا رہے ہیں۔

یہاں کا جیلخانہ بھی قابلِ دید ہے۔ بیرونی دیوار جو بہت بلند ہے بشکلِ مربع بنی ہوئی ہے۔ اس چار دیواری کے اندر تھوڑی سی کھلی جگہ چھوڑ کر ایک ہشت پہلو احاطہ ہے۔ اس احاطے کی اندرونی جانب پھرتے فراخ کمرے بنے ہوئے ہیں جن کے سامنے لوہے کی مضبوط سلاخوں کے جنگلے لگے ہیں اور برآمدہ بھی ہے۔ اس جگہ دن کے وقت قیدیوں کو علیحدہ علیحدہ مقفل کر دیا جاتا ہے اور وہ اپنے اپنے کاموں میں مشغول رہتے ہیں۔ کوئی دری یا تولیہ بُنتا ہے۔ کوئی چکی پیستا ہے۔ کوئی کھانا پکاتا ہے۔ غرض کُل کام قیدی اپنے ہاتھوں سے ہی کرتے ہیں۔ اس ہشت پہلو احاطے کے اندر اور تھوڑی کھلی جگہ چھوڑ کر دوسرا ایک ایسا ہی ہشت پہلو احاطہ ہے جس میں رات کو قیدی سونے کے لئے چلے جاتے ہیں۔ بالکل بیچوں بیچ میں ایک منارہ نما بُرج بنا ہوا ہے۔ اس بُرج میں داخل ہونے کے لئے جیل خانے کے اندر کوئی دروازہ نہیں ہے بلکہ جیلخانے کے باہر اس کا داخلہ ہے اور سرنگ کے ذریعے سے اس بُرج تک پہنچ سکتے ہیں۔ یہ اہتمام اس غرض سے کیا گیا ہے کہ اگر کسی وقت قیدی باغی ہو جائیں تو باہر سے فوج سرنگ کے راستے بُرج پر پہنچکر ان کو زیر کر سکے۔ مجرموں کو۔ خود انہیں کے قول کے مطابق۔ یہاں سوائے قید کے اور کوئی تکلیف نہیں ہے

ہر قسم کا آرام ہے۔ کھانا بھی اچھا ملتا ہے۔ تمام احاطوں میں خوشبودار پھولوں اور رنگ برنگ کے پتوں کے پودے لگے ہوئے ہیں۔ سب سے زیادہ جس چیز نے مجھے حیرت میں ڈالا وہ یہاں کی صفائی تھی۔ زمین پر کہیں ایک تنکا بھی پڑا ہوا نظر نہیں آیا۔ قیدیوں کے جسم اور کپڑے بھی صاف ستھرے تھے۔ قیدیوں کے چہروں پر وہ کرختگی اور وحشیانہ پن بھی نہیں پایا جاتا تھا جو بالعموم جرائم پیشہ اشخاص کی شکلوں سے ظاہر ہوتا ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ ہر قیدی کو اپنے اپنے مذہب کے طور پر عبادت کرنے کی تاکید ہے۔ بعض مسلمان قیدیوں کو میں نے تلاوت قرآن میں مشغول دیکھا۔ معلوم ہوتا ہے داروغۂ جیلخانہ بڑا ادب آموز شخص ہے کیونکہ ہر ایک کام بڑی باقاعدگی سے انجام پاتا ہے اور قیدی ہم کو آتا دیکھ کر فوراً ایک طرف ہٹ جاتے تھے اور نہایت ادب سے سلام کرتے تھے۔ باہر کے پھاٹک پر تو سنتریوں کا پہرہ ہے ورنہ جیلخانے کے اندر چوکیدار اور کنجی بردار بھی سب کے سب نیک چلن قیدی ہی ہیں۔

کالج اور جیلخانے کے علاوہ۔ بہادر خاں ہائی اسکول۔ مہابت مدرسہ۔ کتب خانہ۔ میوزیم۔ جنامیوں کا دارالامان۔ محلات۔ مقبرے۔ مسجدیں۔ بہت ساری عمارتیں قابل دیکھنے کے ہیں جن کے بیان کو بخوفِ طوالتِ مضمون قلم انداز کرنا پڑتا ہے۔ ہاں۔ مہابت مدرسے کے متعلق۔ جو صرف مسلمان طلبا کے لئے مخصوص ہے۔ میں یہ بات کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ریاست کو جیسی توجہ اس مدرسے کیطرف ہونی چاہئے ویسی نہیں ہے۔ تنخواہیں کم ہونے کی وجہ سے طبقۂ معلمین تشفی بخش نہیں ہے اکیلی ریاست ہی پر الزام لگانا بھی بجا نہیں مسلمان رعایا بھی اپنی اولاد کو اس مدرسے میں بھیجنے سے غافل اور بے پروا ہے۔

شہر کے ایک مغربی دروازے سے۔ جو ننھلی دروازہ کہلاتا ہے۔ ایک ترچھی سڑک عیدگاہ کو چلی گئی ہے اور پھر عیدگاہ سے مڑکر جنوب کی طرف سیدھی چلی جاتی ہے۔ یہ سڑک جوناگڈھ کی بہترین تفریح گاہ ہے۔ کل سڑک کوئی دو میل تک باغات کے ایک سلسلے میں ہو کر گذرتی ہے۔ کہیں بڑے بڑے

سایہ دار درخت ہیں۔ کہیں دو باغوں کے درمیان کچھ لہلہاتے ہوئے کھیت ہیں۔ گرمیوں میں شام کو جب گاڑی اس سڑک سے گذرتی ہے تو وہاں کی خنکی اور تر و تازگی سے دل کی کلی کھل جاتی ہے۔ میں روزانہ اس سڑک پر سیر کے لئے ضرور جاتا تھا۔ اس سڑک پر جو پہلا باغ ملتا ہے وہ سردار باغ کہلاتا ہے۔ یہ باغ بہت پرانا ہے جس کو سردار خاں فوجدار سورٹھ نے ۱۰۹۲ھ مطابق ۱۶۸۱ء میں بنوایا تھا۔ یہاں گرکے ایالدار شیروں کی ایک بڑی تعداد پنجروں میں مقید ہے اور دیگر نادر حیوانات مثلاً لاما وغیرہ بھی جمع کئے گئے ہیں۔ باغات کا سلسلہ موتی باغ پر ختم ہوتا ہے جس سے نکل کر "پریوں کے تلاؤ" پر پہنچتے ہیں۔ یہ تالاب بہت بڑا ہے اور پختہ بنا ہوا ہے لیکن اب خشک ہو گیا ہے۔ کہتے ہیں اگلے زمانے میں پریاں اس تالاب میں نہایا کرتی تھیں اس لئے اس کو پریوں کا تلاؤ کہتے ہیں۔ حقیقت میں یہ مقام نہایت پُر فضا اور دلکشا ہے اور پریاں یہاں نہاتی ہوں یا نہ نہاتی ہوں مگر مشرقی بامذاق طبیعتوں نے اس کو یہ نام دیکر اپنی مناظر فطرت کی قدردانی اور نزاکت پسندی کا ثبوت دیدیا ہے۔ افسوس ہے کہ جوناگڈھی اس سڑک کی سیر سے لطف نہیں اٹھاتے۔ انکو تو بس بازار میں حلوائیوں اور بھٹیاروں کی کثیف دکانوں کا دھواں ہی زیادہ تر مرغوب ہے راہیں دکانوں کے گرد منڈلاتے رہتے ہیں۔

حضور نواب صاحب کی خدمت میں باریابی کا شرف شب جمعہ کو حاصل ہوتا ہے کیونکہ اس شب کو حضور گویا ایک چھوٹا سا دربار منعقد فرماتے ہیں اور جمعہ کے روز تمام دفاتر میں تعطیل رہتی ہے۔ یہاں یہ کہدینا مناسب ہے کہ جوناگڈھ میں دن رات اور رات دن ہے۔ ملاقات و بازدید۔ ضیافت مہمانداری کھیل تماشے۔ ناچ رنگ۔ سب کچھ رات ہی کو ہوتا ہے۔ میرے زمانہ قیام میں دو جمعہ کی راتیں واقع ہوئیں اور دونوں راتوں کو میں شرف باریابی سے ممتاز و سرفراز کیا گیا۔ سرشام ہی سے کوئی دو گھنٹے تک تو حضور عام عرضداروں کی عرضیاں سنتے اور ان کے متعلق احکام صادر فرماتے رہے۔ ٹھیک نو بجے میری طلبی ہوئی۔ متعدد سپاہی ننگی تلواریں لئے پہرہ دے رہے تھے

چوبدار سنہری روپہلی عصا لئے کھڑے تھے۔ نشست فرشی تھی۔ حضور صدر میں مسند پر رونق افروز تھے۔ دائیں بائیں عہدہ دار و مصاحبینِ خاص براتب بیٹھے ہوئے تھے۔ جس وقت میں مسند کے روبرو پہنچا حضور ایک مصاحب سے گفتگو میں مصروف تھے۔ چوبدار کی صدا "سلام پر نگاہ رہے مہربان ——— سلام" نے حضور کو میری طرف متوجہ کیا۔ آداب بجالا کر میں نے سرِ تسلیم خم کئے ہوئے نذر پیش کی۔ حضور نے نذر قبول فرمائی اور بیٹھنے کی اجازت دی۔ دیر تک ازراہِ ذرہ نوازی تفتیشِ حالات فرماتے رہے اور نہایت خندہ پیشانی سے پیش آئے۔

عبد الحافظ باعکظہ

ضروری اطلاع

ہمارے پاس اکثر خطوط ایسے آئے ہیں جن میں کسی پرچے کے نہ پہنچنے کی شکایت ہوتی ہے اور عموماً اس شکایت کا باعث دفترِ مخزن کی بدنظمی قرار دیجاتی ہے۔ ناظرین ہماری اس دلشکنی کا اندازہ نہیں کر سکتے جو اس قسم کی شکایتوں سے محسوس ہوتی ہے۔ ہم اپنے ناظرین کو یقین دلاتے ہیں کہ یہاں رسالے کی روانگی میں ہر طرح سے احتیاط کیجاتی ہے۔ اور یہ کبھی ممکن نہیں کہ کسی صاحب کے نام رسالہ بھیجنے میں فروگذاشت ہو جائے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کسی وقت اہالیانِ ڈاک کی غفلت سے رسالہ نہ پہنچے۔ اس کو انسداد کے لئے ایک دفعہ یہاں لاہور کے انسپکٹر صاحب نے ڈاک خانے میں خود بیٹھکر ہمارے رجسٹر کے ساتھ ہر پیکٹ کا مقابلہ کیا۔ مگر پھر بھی اس شکایت کا انسداد نہ ہو سکا۔ شکایتیں برابر آئیں۔ اگر ناظرین مفصلہ ذیل امور ملحوظِ خاطر رکھیں تو اس قسم کی شکایتوں کے پیدا ہونے کا امکان کم ہو جائے۔

(۱) تبدیلیِ مقام و پتہ سے ہر وقت دفترِ ہذا کو مطلع فرماتے رہا کریں۔

(۲) خط و کتابت کے وقت اپنا نمبر رجسٹر اور مفصل پتہ تحریر فرمایا کریں۔

(۳) اپنی ڈاک کے انتظام کا بھی خیال رکھیں۔

(۴) جب رسالہ نہ پہنچے تو فوراً دفترِ ہذا میں اطلاع دیں۔

خاکسار مینیجر

فنِ شاعری

(۴)

شاعری کے مدارجِ مذاق - یا امتیاز یہ

کوئی شخص اس خاصہ طبیعت یا مذاق ممتاز کی نفی نہیں کرسکتا - جو ہر ایک شخص کی طبیعت میں متودعہ ہے - ہر طبیعت ایک خاص مذاق یا ایک جُداگانہ امتیاز رکھتی ہے - گو ہر طبیعت میں مختلف مذاق ہوتے ہیں لیکن اُن سب میں سے ایک مذاق مقابلتاً خصوصیت رکھتا ہے - اس خاص یا ممتاز مذاق کی خصوصیت ہوتی ہے - وُہ گو کسی وقت یا کبھی کبھی تصنع اور لطائف الحیل سے مخفی رکھی جاسکتی ہے - لیکن پھر بھی کچھ نہ کچھ اُس کا شائبہ پڑ ہی جاتا ہے -

بعض لوگوں کا یہ مقولہ ہے - کہ ممتاز یا خاص مذاق بدل سکتا ہے - اور اس میں وہ خصوصیت نہیں رہتی جس سے وہ ممتاز یا مختص ہوتا ہے - اُدھر واقعاتِ مختلفہ یہ ثابت کرتے ہیں - کہ خاص مذاق یا رجحانِ غالب گو کہ خاص یا بعض اسباب سے دھیما یا مدھم پڑ جائے - مگر کالعدم نہیں ہوسکتا - اور نہ اس میں ایسی تبدیلی آسکتی ہے - جس سے اُس کی خصوصیت بالکل ہی اُڑ جاوے -

اس بحث میں سب سے اوّل دیکھنا یہ ہے - کہ مذاق خاصہ سے مراد کیا ہے - یہ ہم مانتے ہیں کہ انسان کی طبیعت چند اور مختلف مذاق بھی رکھتی ہے - اور یہ بھی ثابت ہے - کہ اُن سب میں سے صرف ایک ہی مذاق خصوصیت رکھتا ہے - جو مذاق خصوصیت رکھتا ہے - دراصل وہ سرآمد اذواق ہوتا ہے - اور دُوسرے الفاظ میں یُوں کہا جاویگا - کہ وُہ عین طبیعت ہوتا ہے - یا یہ کہ طبیعت اس سے ایسی خصوصیت رکھتی ہے - کہ جو دُوسروں سے نہیں ہوتی - کتنا ہی اُسے چھپایا جائے اور کتنا ہی اس پر پردہ ڈالا جائے - کبھی نہ کبھی وُہ جھلک مار ہی جاتا ہے - ایک حکیم کہتا ہے - کہ خاص مذاق انسانی زندگی

کا سہارا یا مشغلہ ہوتا ہے۔ اور طبیعت ..... اُسے
اپنے ساتھ ہی لاتی۔ اور ساتھ ہی لیجاتی ہے۔

فلسفہ شاعری کے اِعتبار سے شاعرانہ طبائع میں جس قدر خاص مذاق پائے جاتے ہیں۔ وہ مختلف پہلو رکھتے ہیں۔ اور انہیں مختلف پہلوؤں کے اِعتبار سے شاعری کے مذاقیہ یا اِمتیازیہ مدارج بھی ہیں اور انہی مختلف اذواق کے لحاظ سے ہر ایک مُلک اور ہر ایک قوم میں شاعری کی تفریق اور تشعیب بھی ہوتی رہتی ہے۔

ہم مختصراً مندرجہ ذیل اقسام پیش کرتے ہیں:۔

- مذاق مشکل پسند۔
- " سہل پسند۔
- " خاص پسند۔
- " عام پسند۔
- " باطن پسند۔
- " ظاہر پسند۔
- " تقلید پسند۔
- " آزادی پسند۔
- " اصل پسند
- " نقل پسند۔
- " امن پسند۔
- " جنگ پسند۔
- " مدح پسند۔
- " ہجو پسند۔
- " فلسفیانہ
- " صوفیانہ
- " رندانہ
- " عاشقانہ

اگرچہ مذاق کے اور مراتب بھی ہونگے۔ مگر موٹی موٹی صورتیں ہیں۔ یا اس کے قریب قریب ہیں۔ اُن اقسام میں سے جو مذاق کسی طبیعت پر غالب ہوتا ہے۔ اُسی زمین میں اس کی شاعری بھی ہوتی ہے میں یہ نہیں کہونگا۔ کہ ایسی طبیعت دوسری زمین میں شعر نہیں کہہ سکتی۔

کہہ سکتی ہے۔ لیکن برتری اور فوقیت اُسی زمین میں رہیگی۔ جس کا مذاق غالب ہے۔ کیا ہم دیکھتے نہیں ہیں کہ بعض طبیعتیں مشکل پسند ہوتی ہیں۔ اور بعض سہل پسند۔ بعض طبائع میں عاشقانہ مضامین کا غلبہ ہوتا ہے اور بعض میں صوفیانہ مواد کا ہجوم۔ بعض بعض فلسفی زمین میں مشاق ہوتی ہیں۔ اور بعض رزم وبزم میں۔ بعض قدرتی مواد کا چربہ اتارتی ہیں۔ اور بعض نقل پسند۔ بعض کے اشعار میں بالکل مایوسی اور اداسی پائی جاتی ہے۔ اور بعض طبائع اداسی نما واقعات میں بھی اپنا رنگ دکھا جاتی ہیں۔

بعض سلامت روی سے طبع آزمائی کی عادی ہیں۔ اور بعض باوجود حزم واحتیاط کے بھی نکتہ چینی پر مائل بعض تقلید پسند اور بعض شیدائے آزادی۔ ایک شاعر طبائع شاعرانہ کی نسبت مختلف شکاری جانوروں سے دیتا ہے۔ اگر ایک ہی صیدگاہ میں مختلف شکاری پرندے چھوڑے جاویں۔ تو ہر ایک کی جھپٹ اور رُخ جداگانہ ہوگا۔

شاعروں کی تشبیب کیوں ہوگئی۔

صرف اسواسطے کہ طبائع کے مذاق میں فرق تھا۔ معمولی اور عام مذاق میں تو شاعر کی طبیعت قابو میں رہ سکتی ہے۔ لیکن خاص مذاق کی حالت میں طبیعت خودبخود اِس مرکز پر جا رہتی ہے۔ جس پر مذاقیہ گھڑی کی سوئی قائم ہوتی ہے۔ شاعر بہتیرا زور لگاتا ہے کہ اُس دائرے سے نکل جاوے مگر زورِ مذاق طوعاً کرہاً اس خاص دائرے میں لے ہی آتا ہے۔ بیشک فردوسی اور سعدی یا حافظ اور صائب فارس میں۔ غالب۔ سودا۔ میر۔ درد۔ آزاد۔ حالی۔ امیر مینائی۔ داغ۔ اقبال ناظر۔ نیرنگ۔ نذیر۔ ریاض۔ حسرت۔ جلال۔ شاد۔ شاطر۔ اکبر۔ شوکت۔ طالب۔ ارشد۔ ناظم۔ حبیب ہندوستان میں چیدہ شاعروں میں سے ہیں۔ یا یہ کہ لوگوں کی انہیں پر نظر پڑتی ہے۔ اور

ہر شعبہ شاعری میں یہ کام لے نکلتے ہیں - مگر اگر غور سے دیکھو تو شہرت انہیں بھی کسی خاص شعبہ میں ہی ہوگی - اُن کے کلام سے تاڑنے والے تاڑ جاتے ہونگے - کہ ان کی طبائع کا مذاق خاص کونسا ہے۔

سعدی بڑا نامور شاعر اور ہمہ دان گذرا ہے - لیکن فردوسی کے مقابلے میں باعتبار رزمیہ شاعری کے نہیں آسکتا اسی طرح فردوسی - سعدی کا مقابلہ اس کی اپنی زمین میں نہیں کر سکتا - امیر مینائی کے رنگ میں مرحوم داغ مشکل ہی سے بازی لیجا سکتے ہیں - اور امیر مرحوم داغ کی زمین میں ذرا جھجک کر ہی قدم رکھینگے -

ان سب نامورانِ زمان کے دواوین مقابلتاً سامنے رکھکر دیکھو -

"ہر گُلے را رنگ و بُوئے دیگر است"

یہ جدابات ہے - کہ ایک شاعر طبیعت کے اعلیٰ مذاق کے خلاف دُوسری زمین میں مشق کرتا ہے - اور اس میں بھی کچھ نہ کچھ درجہ اور ملکہ پیدا کر لیتا ہے - یہ ایک مشق ہے - جو اس بحث سے خارج ہے -

زمانہ اور شاعری -

جو کچھ ہمارے اِرد گرد پایا جاتا ہے - یا جو کچھ ہم دیکھتے اور سنتے ہیں - یہ سب زمانہ یا زمانے کے آثار اور مظاہر ہیں - ہر زمانے میں جو جو علوم اور جو جو فنون مروّج ہوتے ہیں - وُہ زمانہ موجودہ کی زد یا تاثیر سے محفوظ نہیں رہ سکتے - اور یا یُوں کہئے - کہ ایسے تمام علوم و فنون زمانہ موجودہ کے آثار اور مدخلات سے ہی ترکیب اور ترتیب پاتے ہیں -

اِن سب علوم یا فنون میں سے موسیقی اور شاعری کا ایسا فن ہے - جس پر موجودہ زمانے کے آثار کا بہت کچھ یا فوری اثر ہوتا ہے - اِن دونو فنون کی گرم بازاری زیادہ تر زمانے کے مقتضیات پر موقوف ہے - بعض وقت زمانے کی رفتار اور زمانے کی تقلید بڑے بڑے شاعروں کو بھی مذاق کش بنا دیتی ہے - گو ان کا مذاق کچھ اَور ہوتا ہے لیکن انہیں زمانے کے مقتضیات کی بدولت مذاق میں تبدیلی کرنی ہی پڑتی ہے -

کچھ شک نہیں کہ فنِ شاعری اور خصوصاً شاعری کا اعلیٰ زینہ یا معراج اُس خالص مذاق پر بہت کچھ موقوف ہی۔ جو طبعاً ہر ایک شاعر رکھتا ہے۔ لیکن مقتضیاتِ زمانہ کا اتباع بھی بعض اوقات سخت لازمی ہوجاتا ہے اور باوجود اس کے بھی شاعر زمانے کے رنگ میں رنگا جاکر اپنے خاص مذاق کی جھلک دے ہی جاتا ہے۔

ایک طرف شاعر طبعی مقتضیات کے مطابق اپنی فرقہ بندی کرتے ہیں۔ اور دُوسری طرف زمانہ بھی انکی جماعت بندی کرتا ہے۔ بعض اوقات شاعروں کے طبعی اذواق بالکل مدھم اور دھیمے پڑجاتے یا رنگ خوردہ ہوجاتے ہیں۔ کیونکہ زمانے کی بیجا دست بُرد اور بیجا تحریص و ترغیب اصل جدّتِ طبائع پر پردہ ڈال دیتی ہے۔ اور اُن انوار اور اشعہ پر ایک حجاب سا آجاتا ہے۔ جو معراجِ شاعری کا زینہ ہیں۔

گو زمانہ اپنے زور سے شاعروں کی جماعت بندی کرتا ہے۔ لیکن شاعر بھی اپنے مخترعات اور موجدات سے زمانے پر بہت کچھ اثر ڈالتے اور اہل زمانہ کو ایک خاص مذاق کی طرف لیجاتے ہیں۔ جادو بیان شاعروں کی نظموں اور شاعری نے بعض وقت زمانے کے لوگوں اور موجودات پر ایسا فوری اثر کیا ہے۔ کہ اہل زمانہ کی کایا پلٹ دی ہے۔ گو ایک شاعر زمانہ اور اہلِ زمانہ سے ہی سب کچھ لیتا ہے۔ لیکن جب اس کا معاوضہ دیتا ہے۔ تو اِس خوبصورتی سے کہ دونو میں نور اور ظلمت کی نسبت ہوجاتی ہے۔ ایک کاریگر عام مواد سے ایک ایسی مشین تیار کرتا ہے۔ جو سب کی نظروں میں سودمند اور بھلی معلوم ہوتی ہے یہی حال شاعر کا ہے۔ شاعر عام واقعات خشک سانحات۔ مخفی کیفیات اور کھردرے الفاظ میں جان بخش اثر ڈالتا اور ایک ناموزون اور بھدّی صورت کا مبادلہ دلچسپی سے کرتا ہے۔ جب کبھی شاعر زمانہ کی گندی مقتضیات سے دوچار ہوتا ہے تو اسوقت باوجود نفاستِ طبع اور مذاقِ پاکیزہ کے بھی شاعری دوڑ میں ایسے ایسے ناگفتہ بہ مقامات بھی آجاتے ہیں جو کسی قدر یا بالکل مرکزِ تہذیب سے ہٹے ہوتے ہیں۔ بعض شاعر اس دوڑ

میں جان بوجھ کر شامل ہوتے ہیں - اور بعض طوعاً و کرہاً یہی خوفناک وقت ہے - جس سے ایک قوم کے لٹریچر اور علم ادب میں گندی باتوں اور گندے خیالات کا نشوونما یا مجموعہ ہونے لگتا ہے - یہی خوفناک منزل ہے - جو ایک قوم یا ایک ملک کے علم و ادب کے راہوں میں مزاحم ہوتی اور اُسے بدنام کرتی ہے یہ عمل اسواسطے بھی زیادہ ہوتا ہے - کہ شاعر پسند طبیعتیں خاص خاص ہی ہوتی ہیں - اور ان خواص میں سے اکثر طبیعتیں نری شعر پسند ہوتی ہیں - اور اس بات کی عادی کہ نظم یا شاعری کا اکثر حصہ انکی طبایع کے موافق ہو - چونکہ شاعروں کا قرب انہیں لوگوں سے ہوتا ہے - اسواسطے بعض اوقات انہیں طوعاً و کرہاً ایسے مقامات سے بھی گذرنا ہی پڑتا ہے - اور رفتہ رفتہ انہیں کے نقش قدم پر عام شاعر بھی اس زمین میں بہت کچھ حصہ لینے لگ جاتے ہیں - جس کا اثر یہ ہوتا ہے - کہ ناسودمند اور بُرے مواد بہت جلد سرزمین شاعری میں نشوونما پاتے اور نظر آنے لگ جاتے ہیں -

ایک جنگجو بادشاہ کے زمانے میں شاعروں کا زور نسبتاً نظم رزمیہ پر ہی زیادہ ہو جاتا ہے اور ایک عیاش سُلطان کے عہد میں گل و بُلبل اور زلف و خال کی تفسیر پر ہی طبع آزمائی کیجاتی ہے - جس قوم اور جس مُلک میں آزادمنشی اور حق گوئی کا مشرب گوئے سبقت لیجاتا ہے - اس میں شاعروں کی جماعت باعتبار اپنے اپنے مذاق کے سرزمین شاعری میں آتی اور مشق کرتی ہے یہی دور - اور یہی زمانہ شاعری کے معراج کا زمانہ اور شہرت کا زینہ ہے - ایسے ہی زمانے میں اصلی یا طبعی شاعری پر روشنی پڑتی ہے - اور ایسے ہی زمانے میں ایک شاعر اپنے جواہر طبیعت سے زمانہ اور اہل زمانہ پر روشنی ڈالتا ہے -

باقی آیندہ

مخزن کی گذشتہ جلدیں از اپریل سنہ ۱۹۰۲ء لغایت ستمبر سنہ ۱۹۰۵ء بڑی کوشش سے ہم پہنچائی گئی ہیں - اور جلدیں نہایت خوبصورت اور بڑے اہتمام سے تیار ہوئی ہیں - اور جلد کی پُشت پر لفظ مخزن اور نمبر جلد خوشنما سنہری حروف میں لکھا ہوا ہے - شائقین جلد منگوالیں - کیونکہ جلدیں تھوڑی ہیں -
قیمت علاوہ محصولڈاک
جلد قسم اول ۶ع قسم دوم عہ
مینیجر

کنارِ راوی

سکوتِ شام میں محوِ سرود ہے راوی
نہ پوچھ مجھ سے جو ہے کیفیت مرے دل کی

پیامِ سجدہ کا یہ زیر و بم ہوا مجھ کو
جہاں تمام سوادِ حرم ہوا مجھ کو

سرِ کنارۂ آبِ رواں کھڑا ہوں میں
خبر نہیں مجھے لیکن کہاں کھڑا ہوں میں

شرابِ سُرخ سے رنگیں ہوا ہی دامنِ شام
لئے ہے پیرِ فلک دستِ عشرہ میں جام

عدم کو قافلۂ روز تیز گام چلا
شفق نہیں ہے یہ سورج کے پھول ہیں گویا!

کھڑے ہیں دور وہ عظمت فزائے تنہائی
منارِ خواب گہِ شہسوارِ چغتائی

فسانۂ ستمِ انقلاب ہے یہ محل
کوئی زمانِ سلف کی کتاب ہے یہ محل!

نظارۂ موج کو پھر وجہِ اضطراب ہے کیا؟
یہ کہنہ مشق نوآموزِ پیچ و تاب ہے کیا؟

مقام کیا ہے سرودِ خموش ہے گویا
شجر! یہ انجمنِ بے خروش ہے گویا

نمازِ شام کی خاطر یہ اہلِ دل ہیں کھڑے
مری نگاہ میں انسان پا بگل ہیں کھڑے

رواں ہے سینۂ دریا پہ اک سفینۂ تیز
ہوا ہے موج سے تلاحم جس کا گرم ستیز

سبک روی میں ہے مثلِ نگاہ یہ کشتی
نکل کے حلقۂ حدِ نظر سے دور گئی

جہازِ زندگیِ آدمی رواں ہے یونہیں
ابد کے بحر میں پیدا یونہیں نہاں ہے یونہیں

شکست سے یہ کبھی آشنا نہیں ہوتا
نظر سے چھپتا ہے لیکن فنا نہیں ہوتا

اقبال

وفاتِ بیان

سید بیان مرحوم اُردو و فارسی کے ایک مشہور شاعر ہوئے ہیں۔ اُن کے ارشد تلامذہ سید علی حسین تمیم بلند شہری نے اُن کا مرثیہ لکھا ہے۔ میر تمیم کی چند غزلیں اس سے قبل مخزن میں شائع ہو چکی ہیں اُن سے سوائے لکھنوی مذاق کے اَور کسی بات کا پتہ نہیں چلتا۔ ناظرین کو ذیل کے مرثیے سے معلوم ہوگا کہ حضرت تمیم ایک پختہ کار شیریں گفتار شاعر ہیں۔ سید تمیم مرثیہ بھی پڑھتے ہیں اور اپنی تصنیف بھی پڑھتے ہیں۔ مرثیہ گوئی کی طرز اور مرثیہ پڑھنے کا انداز اُستادانِ لکھنؤ کو یاد دلاتا ہے

حسرت زدگاں کی داستاں ہے ۔ چھایا ہوا غم کا اک سماں ہے ۔ تھی جس میں بہارِ رنگِ معنی ۔ آباد وہ باغ اب کہاں ہے
سالار کو ڈھونڈھتی ہیں آنکھیں ۔ ٹوٹا ہوا رہ میں کارواں ہے ۔ گم ہے علمِ بیاں کا سایہ ۔ ہر دل پہ یہ نقش ہر نشاں ہے
جس گھر میں ہو چراغ روشن ۔ بدتر وہ گور سے مکاں ہے ۔ برباد رہا ہوا جو آباد ۔ معمورۂ غمکدہ جہاں ہے
عیاری زالِ دہر کا حال ۔ واللہ کہ ہو بہو عیاں ہے ۔ اللہ رے چرخِ پیر کی گھات ۔ یہ دشمنِ جاں عدوی جاں ہے
ساماں تھا جو کل نظر کے آگے ۔ وہ آج نگاہ سے نہاں ہے

ہے سر پہ اگر یہ دورِ افلاک
مٹ جائیں گی حسرتیں تہِ خاک

دُنیا کے فریب ہیں نرالے ۔ کس خواب میں ہیں خیال والے ۔ کیا آگ ہے اس کی سرد مہری ۔ سوزش سے پڑے جگر پہ چھالے
ہے چار طرف وہ دامِ تزویر ۔ ممکن ہے کوئی کہ جاں بچالے ۔ دھوکے ہیں کبھی نہ آسکو آنا ۔ پڑ جائینگے زندگی کے لالے
جمشید کا جام تاجِ فغفور ۔ بہرام نے ٹھوکروں میں ڈالے ۔ حیرت ہے کہاں گیا سکندر ۔ آئینہ کو دیکھ لے دکھالے
غواص اُتر کے پھر نہ اُبھرا ۔ ڈوبے ہیں تو اُس نے کب نکالے ۔ چھوڑا نہ کسی میں سانس باقی ۔ بیمار نہ لے سکے سنبھالے
کیا طفل۔ جوان و پیر کیسے ۔ زندہ کیئے موت کے حوالے

غارت ہوئی رونقِ جہاں آج
دُنیا سے اُٹھا وہ خوش بیاں آج

بیگانہ مزاج وہ یگانہ مانے ہوئے جسکو سب زمانہ دیکھی جو چمن کی بے ثباتی بلبل نے اٹھایا آشیانہ
اُستاد مسلّم الثبوت آہ یُوں تیرِ اجل کا ہو نشانہ گمنام تھا نامِ قیس و فرہاد تازہ کیا اُس نے یہ فسانہ
ہر بات میں بات اور نئی بات تقریر تھی یہ مدبرانہ تلوار صفت عدو سے ملنا یُوں میل ہر اک سے مشفقانہ
خلقِ حسنی محب نوازی برتاؤ تمام دوستانہ وہ حُسنِ کلام با فصاحت وہ طبع ظریف عاشقانہ
چھوڑا نہ مقام گوشۂ شعر اللہ رے خیالِ شاعرانہ

بستی نظر آئے کیوں نہ خالی
جب شہر کا اُٹھ گیا ہو والی

وُہ شاعرِ نکتہ سنج نامی مخدوم و مکرّم و گرامی پہنچا ہے دماغ کسی کا تا عرش ہاتھ آئی کسے یہ خوش کلامی
تھا معرکہ گیر رزمِ اشعار وہ ہند کا سعدیؒ و نظامیؒ میزانِ نظر میں ہیں برابر یزدانی و انوری و جامی
اِس یُوسفِ حسنِ شاعری نے بخشی ہے مجھے خدمتِ غلامی حالاتِ شرف لکھوں کہاں تک سرمایۂ وصف ہیں تمامی
وہ خضرِ سخن وہ چشمۂ فیض وہ قوتِ دل معین و حامی تسلیم کو سر جھکا نہ جس کا سرکش ہُوئے آکے خود سلامی
خامہ ہے شکستہ دل پریشاں کیونکر نہ رہے سخن میں خامی

ہر بار یہ گوش زد صدا ہے
دِل خانۂ ماتم و عزا ہے

تابوت اُٹھا کے لے چلے ہیں منہ ہم سے چھپا کے لے چلے ہیں مُجموعۂ عطرِ نکہتِ شعرؔ سے میت کو بسا کے لے چلے ہیں
جائیگی کہاں برات آخر دولہا جو بنا کے لے چلے ہیں دریائے سخن کے ناخدا کو کیا گھر سے* خدا کے لے چلے ہیں
یا شیرِ سخنوری کو احباب بیشے سے چھڑا کے لے چلے ہیں اُس ہیروئے ملکِ زندگی کو رستے پہ قضا کے لے چلے ہیں
خُوں گشتۂ آرزوئے مشتاق دِل کسی کا دُکھا کے لے چلے ہیں ظاہر ہے ہوائے مرگ ہر سو جھونکے یہ فنا کے لے چلے ہیں

وہ تشنۂ لطفِ زندگی تھا شوقِ آبِ بقا کے لیچے میں

وہ بلبلِ خوش بیاں ہے خاموش

ہیں غم سے اڑے ہوئے یہاں ہوش

آج اسکو کہاں سے جا کے لائیں لکھ پڑھ کے کسے غزل سنائیں کس گوشے میں ہم زمیں پہ ڈھونڈیں ہاتھ آئے تو آسماں پہ جائیں
ہے کون شفیق ایسا اُستاد تصنیف کی جس سے داد پائیں قسمت سے مٹا مآلِ تدبیر بگڑی ہوئی کس طرح بنائیں
ثابت ہوا رنگِ دورِ افلاک دم بھر میں پلٹ گئیں ہوائیں انبوہِ جہاں ہے عرصۂ حشر بیٹھے ہوئے کیا نظر اٹھائیں
آلودۂ درد و غم ہیں دن رات دل کس کا دکھا کے دل دکھائیں بادل ہے ہماری آہِ سوزاں ہر سمت سے چھا گئیں گھٹائیں
ہے دل میں کہ روئیں اب بہا اشک آنکھوں سے جگر کا خوں بہائیں

آزردہ اگر یوں ہی رہیں گے

دکھ درد کسی سے کیا کہیں گے

حاصل ہوئی کب کسے یہ توقیر ہر صورتِ نقش دل پہ تحریر کیا خوب ہو خوبیٔ بیاں آہ باتوں میں اثر زباں میں تاثیر
موہوم تھے جس قدر مضامیں کھینچی قلمِ سخن سے تصویر مستور ہے جامع المعانی یزدانیٔ خوش بیاں کی تقریر
دعوے کو کیا اسی نے باطل کام آئی نہ مدعی کی تدبیر دیکھا ہے مشاعروں میں بھاگے اُستاد کے سامنے سے بے پیر
سیفی تھا ہر ایک فقرۂ نثر مصرعے تھے کھنچے ہوئے کہ شمشیر وہ عیبِ کلام تھا کہ بہروں سن سن کے خموش تھے سخن گیر
کھلتی نہیں بندشِ معانی عاجز ہے نکتہ رس مشاہیر

دم بھر میں اجڑ گیا چمن آج

خالی ہے سخن سے انجمن آج

خوں گشتہ ہے آرزوئے ناشاد حسرت ہوئی شاعری کی برباد کس کس کے غم و الم میں روئیں کس کس کی کریں خدا سے فریاد
اللہ رے شانِ کبریائی برباد ہے کوئی کوئی آباد منظور نہ تھی اسیریٔ دہر پابند تھا کب وہ مردِ آزاد
واللہ کہ شک نہیں یقیں ہے بے مثل وہ طبع تھی خداداد الفاظ میں رنگ اک نرالا اشعار میں اک عجیب ایجاد

ہاتھ آئے یہ بات کب کسی کو — پائی نہ کسی نے طرزِ انشاء
بے شبہ نہیں ہے مثل انکا — جس رنگ میں جو کیا ہے انشاء

بھولینگے نہ زندگی میں ہرگز — اُس سحر کہ گیر نظم کی یاد

دل کش نہ ہو رنگ کیوں زباں کا
ہمصر نہیں کوئی بیاں کا

وُہ میرِ سخن وحید و یکتا — وہ ناسخِ مصحفی و انشا
وُہ نیرِ آسمانِ اشعار — وُہ رُتبہ شناسِ نظمِ اعلیٰ

وُہ سوزِ کلامِ درد آمیز — تعقید و عیوب سے مبرا
آباد تھا اُس سے بزمِ عشاق — اب تک ہے یہ شاعروں میں چرچا

خوش طبع انیسِ بزمِ مضموں — آزردہ مزاج تھا نہ اصلا
پابندِ سخن پھر اُس پہ آزاد — دیکھا نہ سُنا کسی کو ایسا

دلدار و خلیق و مونسِ خلق — زینت دہِ جلسہ احبا
جلتے رہے آتشِ سخن سے — محفل میں مثالِ شمع اعدا

صائب ہے صمیم رائے اپنی — جو کچھ لکھوں وہی ہے زیبا

تھا ذوقِ سخن میں سب سے غالب
وُہ مومن پاک رشک طالب

صمیم بلند شہری

رمضان

لو آگیا رمضاں چھپے ہیں ساری رات — یہ دن پھرے ہیں کہ اب دن سے بھی ہے پیاری رات
طلوعِ مہر سے ہے اب غروبِ شمس عزیز — وہ دن گئے دلِ بیمار پہ ہے بھاری رات
بدلنے دیتے نہ کافورِ صبح سے یہ مشک — ہوئی نہ آئے فلکِ پیر اختیاری رات
کبھی بڑھاتی یہی اور اب بڑھاتی ہے — دلوں میں دن کے تصور سے بیقراری رات
ہر ایک دن ہے شبِ عید۔ شام صبحِ اُمید — فلک نے شام نہ ایسی کوئی سنواری رات

وہ مسجدیں وُہ تراویح وہ صفیں وہ امام
گذر گئی ہے شبینوں میں ساری ساری رات

وہ روشنی کنولوں کی وُہ ریزشِ گلِ شمع
تمام رات ہی محوِ ستارہ باری رات

گذرتے جاتے ہیں روزے بڑھاتی جاتی ہے
دلوں کے حوصلے آ آ کے باری باری رات

عجیب ماہِ مبارک یہ ہے کہ اس کی طرح
کسی کے دن ہیں شماری نہ اعتباری رات

بجا ہے کھینچ کے لائے جو روزِ عید الفطر
یہ روز روز کی تیری امیدواری رات

آزاد عظیم آبادی

نُور و بُور

عالمِ امکاں حباب دریائے بے پایان ہے
بُلبلا پانی کا جس میں ہستیٔ انسان ہے

آدمی کا دل ہے لنگر۔ آبِ دریا جان ہے
نیک عمل کشتی ہے۔ جس کا ناخدا انسان ہے

دو کنارے اس کے ہیں۔ یہ ایک پکّی بات ہے
اِک کنارے پر ہے دن۔ اور دوسرے پر رات ہے

ہو رہا ہے ایک پر آئینہ عالم نُور کا
ایک کی زُلفِ دوتا میں رنگ ہے دیجور کا

ایک کے رُخ پر اُجالا ہے چراغِ طُور کا
ایک گویا ٹمٹماتا سا دیا ہے دُور کا

ایک پر سُورج۔ غدارِ حُور کا آیا ہوا
ایک پر بادل رُخِ رنجور کا چھایا ہوا

ایک پشتے پر شگفتہ ہے چمن بے خار کا
ایک ساحل پر ہویدا گھاٹ ہے تلوار کا

ایک کے دامن میں گچھا گوہرِ شاہوار کا
ایک کے سیلاب میں گرداب ہے آزار کا

ایک کی موجوں میں ظاہر آبِ گوہر صاف صاف
ایک لہروں میں ہے باہر آبِ خنجر صاف صاف

جس کنارے دن ہے اس پر بے خبر سوتا ہے ایک
جس کنارے رات ہے اُس پر کھڑا روتا ہے ایک

آفتابِ عیش سے روشن مکاں ہوتا ہے ایک
آنسوؤں سے منہ اندھیری رات میں دھوتا ہے ایک

دن ہے وارث کے لئے - لاوارثوں کو رات ہے
سر پہ دونوں کے مگر طالب خدا کی ذات ہے!

طالب بنارسی (از بمبئی)

صدائے قومی

سو چکے خوب بس اے میرے عزیزو جاگو
قافلے والے گئے دور - رفیقو جاگو

اس کا افسوس نہیں چلتا جو تھک کر رہ جائے
حیف اُس پر ہے ذرا چل کے جو اُلٹا پھر آئے

ہاں اُٹھو - تاب و تواں تم میں نہیں کیا باقی؟
ہائے کیا ڈال کے مے دے گیا تم کو ساقی!

اُٹھ کے بیٹھو کہ تمہیں دور بہت جانا ہے
رات تھوڑی ہے بڑے طول کا افسانہ ہے

تم نہیں وہ کہ مثل گل تھی تمہاری ہمت؟
تم نہیں وہ کہ دلوں پر تھی تمہاری شوکت؟

پرچمِ اقبال کا دنیا میں اُڑایا کس نے؟
ملکداری کا سبق سب کو پڑھایا کس نے؟

کس سے شاداب ہوا گلشنِ صد علم و ہنر؟
کس سے آغاز ہوا دینِ حقیقت پرور؟

کون تھا نام پہ جو جنگ کے جاں دیتا تھا؟
جم کے جو نام نہ ہٹنے کا کبھی لیتا تھا؟

لو چلو اُٹھ کے کہ دل کش ہے سُہانا ہی سماں
سامنے ٹیلے پہ اُڑتا ہے وہ منزل کا نشاں

اب بھی ہمت جو کرو بات بنی جاتی ہے
سُن لو کانوں سے وُہ آوازِ درا آتی ہے

سیّد نذیر حسین

شباب

نہ پُوچھو دوستو تم ہم سے یہ کہ کیا ہے شباب
ترقیوں کے زمانے کا منتہا ہے شباب

شباب کیا ہی؟ اُمنگوں کا دَور دورہ ہے
کلیدِ عیش ہے طاقت دہِ قوٰی ہی شباب

شباب کیا ہی! خداداد ایک قوّت ہے
زمانہ قدر کا اور عقل و ہوش کا ہی شباب

یہ کیا ہے؟ غازہ روئے بتان و حسنِ بتاں
مسرّتوں کے چمن کے لئے صبا ہے شباب

اسی میں ہوتی ہیں پُر زور قوتیں ساری
ہزاروں لاکھوں دواؤں کی اِک دوا ہی شباب

جو اس میں کر لیا۔ وہ کر لیا۔ رہا تو۔ رہا
قوی سے کام کے لینے کا وقت کیا ہی شباب

اسی کو روتے ہیں ہر وقت یاد کرتے ہیں۔
غرور جتنا کرے جائز اور بجا ہے شباب

اسی کو پُوچھتے ہیں اور اسی کو چاہتے ہیں
عجب زمانہ ہے ہر شخص ڈھونڈتا ہے شباب

ادائیں اس کی وہ پیاری کہ کیا کہوں تم سے
ستم ہے۔ قہر ہے۔ آفت ہی اور بلا ہی شباب

اسی کی دل میں ہی قوت۔ نگاہ میں طاقت
جوانو! شکر کرو رحمتِ خدا ہے شباب

تمام قوتیں اسی کے دم کے ساتھ تو ہیں
یہ دل کا جوش ہے اور نور آنکھ کا ہی شباب

شباب کیا ہے؟ پسندیدگی عام کا پاس
تمام زندگی میں ایک خوشنما ہی شباب

شباب مردوں کا حُسن۔ عورتوں کا زیور ہے
مزے کے لوٹنے کا عین وقت کیا ہی شباب

شباب کیا ہے؟ مزے لوٹنے کا آلہ ہے
تمام عیش پسندوں کا مدعا ہے شباب

بہارِ باغِ جوانی کے لوٹنے والے
اگر ہیں کاہ - تو لاریب کہربا ہے شباب

نظر اُٹھا کے جسے دیکھا محوِ دید کیا
پری رُخوں کی نگر چشم سرمہ سا ہی شباب

حسین جنکو سمجھتے ہیں لوگ عالم میں
وہ دلربا نہیں دراصل دلربا ہے شباب

شباب حسن کا مخزن ہے عشق کا مرکز
جو دیکھو غور سے تو قدرتِ خدا ہے شباب

یہ عقلمندوں کو کرتا ہے دفعتہً احمق
عدوے فہم ہے اور دشمن ذکا ہے شباب

کوئی بچائے متاعِ حجاب کو کیونکر
جہاں میں ایک ہی غارتگر حیا ہے شباب

نہ ہوتا یہ تو نہ ہوتے گناہ لوگوں سے
گنہگار نہیں - قابل سزا ہے شباب

جو بات بات میں شرم و حجاب کرتے تھے
حجاب و شرم کو اُنکی مٹا رہا ہی شباب

جو شکلیں پہلے بری اور کریہ منظر تھیں
حسین آج اُنہیں کو بنا رہا ہے شباب

جو نشہ اس میں ہے ہرگز نہیں شراب میں وہ
نشہ کی چیزوں میں سب سے بڑھا ہوا ہی شباب

جو میں نہیں تو نہ پوچھے گا بات بھی کوئی
بصد غرور حسینوں سے کہہ رہا ہے شباب

جو اپنے حُسن کی قیمت وصُول کرتے ہیں
بس اُن کے واسطے دُنیا میں کیمیا ہی شباب

پھنسا جو دام میں اس کے وہ بچ نہیں سکتا
خُدا بچائے بہت ہی بُری بلا ہے شباب

بناتا ہے یہی بینا کو محض نابینا
جو لوگ اندھے ہیں اُن کے لئے عصا ہی شباب

شباب میں نہیں کچھ نیک و بد نظر آتا
جنون غور سے دیکھو تو دُوسرا ہے شباب

ازل میں حُسن کی لکھی گئی تھی جو لائف
سُنہری حرفوں سے اُس میں لکھا ہوا ہی شباب

کہاں ہیں قدر شناسانِ حُسنِ محبُوباں
عروسِ حجلۂ خوبی بنا ہوا ہے شباب

حسین عورتوں ہی پر نہیں ہے کچھ موقوف
کسی کا کیوں نہ ہو دلچسپ خوشنما ہی شباب

یہ ایک قدرتی محرم ہے جوبنوں کے لئے
غضب کا اُنکو یہ دل کش دکھا رہا ہی شباب

سکھاتا لوگوں کو ہی جو غرور و خود بینی — وہ خود نمائی و نخوت کا آئینہ ہے شباب
رہے شباب کے عالم میں نیک کیا کوئی — ستم ہے دشمنِ ہر نیک و پارسا ہے شباب
جو کام دیتا ہے یہ - کوئی دے نہیں سکتا — جہاں میں سب سے زیادہ گراں بہا ہی شباب
یہ جا کے پھر کبھی صورت دکھا نہیں سکتا — شمیم گل ہے یہ دو روز کی ہوا ہے شباب
شباب کا ہے حقیقت میں کچھ عجب عالم — جو آفتاب ہے انسان تو ضیا ہے شباب
نہ صرف آدمی کا بلکہ ساری چیزوں کا — عجیب دلکش و دلچسپ و دلربا ہی شباب
شباب کیا ہے ؟ یہ ہے ایک خوابِ لطف انگیز — رہیگا اور نہ کسی کا کبھی رہا ہے شباب
جو ناز کرتے ہیں اس پر وہ سخت احمق ہیں — ہوا ہے - صبرِ دلِ درد آشنا ہی شباب
غرور کچھ نہیں لازم شباب کے اوپر — یہ چند روزہ ہے اور محض بے بقا ہی شباب
حسیں کیا ہیں اور ان کا شباب ہی کیا ہے — وہ آشنا ہیں کسی سے نہ آشنا ہی شباب
وہ کون ہے جو بڑھاپے میں یہ نہیں کہتا — پھنسا کے ہم کو مصیبت میں چل دیا ہی شباب
بڑھاپا کیسا ہی ہو جیتے جی کا ساتھی ہے — وہ بیوفا نہیں جیسا کہ بیوفا ہے شباب
ہمیشہ سب نے کہا - اور سب کہیں گے یہی — حباب سے بھی کہیں بڑھ کے بے بقا ہی شباب
یہ اتنی جلد گذرتا ہی کیوں - سبب کیا ہے؟ — شبِ وصال ہے - یا دورِ عیش - یا ہی شباب
غلط ہے کوئی گھڑی گھٹتی ہے نہ بڑھتی ہے — بڑھا ہی شیب کبھی - اور نہ کم ہوا ہے شباب
طویل ہی شبِ فرقت نہ مختصر شبِ غم — نہ رنگ رُخ کی طرح سے گریز پا ہے شباب
زمانہ عیش کا ہوتا ہے مختصر معلوم — اسی سبب سے یہ کہتے ہیں بے بقا ہی شباب
بہت ہی اچھا ہے جو کچھ نہیں ثبات اسے — جرائم اور معاصی ہی پر فدا ہے شباب
رہے جوانی میں جو متقی و نیک خصال — اُسی کا اچھا ہے - پیارا ہے خوشنما ہی شباب
متین کر عملِ نیک اور قدرِ شباب — خدا رکھے ابھی تیرے شباب کا ہی شباب

عبدالمتین (از بھوپال)

کایا پلٹ

اے ساقیِ گلعذار و گلفام
کیوں بند ہے میکشی کا دفتر
مینا ترے منہہ کو تک رہے ہیں
وہ نقش و نگارِ کلکِ صنعت
وہ بوتلیں شربتی گلابی
وہ روز کے تیرے پینے والے
وُہ تیری بہار اُجڑ گئی کیا
کس کا ہے سوگ کس کا غم ہے
وہ غول کہاں ہیں میکشوں کے
کیوں بازیِ گنجفہ ہے ابتر
کل تک تری حالت اَور کچھ تھی
پیشانیِ دلکشادہ و منور
پلکیں تری دلنشیں ستم کوش
آنکھوں میں وُہ لال لال ڈورے
وہ لب ترے غیرتِ گلِ تر
غنچہ سا دھن خزانۂ حسن
گردن تیری شمعِ نور کی سی

اے راحتِ رُوح و دل کے آرام
کیوں طاق پہ رکھدیے ہیں ساغر
کیوں خُم ترے سرنگوں پڑے ہیں
حیرت سے ہوئے ہیں نقشِ حیرت
نارنجی و سُرخ و زرد و آبی
آواز سے تری جینے والے
گُل پر ترے اوس پڑ گئی کیا
کیوں چپ ترا ہارمونیم ہے
جھُرمٹ ہیں کہاں پری وشوں کے
بچھتی نہیں کیوں بساطِ چوسر
رنگ اور تھا صورت اور کچھ تھی
اس پر وہ غضب جڑاؤ جھومر
جادوئے نگاہ سحر آغوش
رخسار وُہ تیرے گورے گورے
وہ دانت فدا تھی جنپہ گوہر
ہر بات تری فسانۂ حُسن
سانچے میں ڈھلی بلور کی سی

حالت ہی یہ کیا یہ کیا سماں ہے
شیشوں سے ٹپک رہی ہے وحشت
گلدستے رکھے ہوئے ہیں باسی
وہ غنچہ و گل بہارِ قدرت
وُہ میز وہ کرسیاں وُہ کنٹر
ای ساقی ماہ وش کدھر ہیں
محفل تری سب اُلٹ گئی کیوں
وہ جامِ شراب لے گیا کون
کیوں بند ہے رقصِ مہ جبیناں
وہ کھیل ترا بگڑ گیا کیوں
ریشم سے وہ بال عنبریں بُو
ابرو ترے غیرتِ مہِ نو
انداز نظر نے دلبری کے
وُہ ہونٹ ترے خطِ ہلالی
اعجاز ترے ہر اک سخن میں
چہرہ کی تراش وہ کتابی
وہ چاہ گہِ شباب سینہ

وہ محفلِ عیش اب کہاں ہے
میخانہ بنا ہے دشتِ حیرت
ہر چیز پہ چھائی ہے اُداسی
مُرجھا کے بنے ہیں خارِ حسرت
سوڈا لیمینڈ - روز واٹر
کیوں حال سے تیرے بیخبر ہیں
تقدیر تیری پلٹ گئی کیوں
وہ نُقل و کباب لے گیا کون
کیوں چُپ ہے سرودِ نازنیناں
وہ راج ترا اُجڑ گیا کیوں
گجرے پھُولوں کے دونوں گیسو
وُہ نرم و سفید کان کی لو
فتنے آنکھوں میں سامری کے
انپر وہ ذرا ذرا سی لالی
سیدھی سی روش وُہ بانکپن میں
رخساروں کا رنگ وُہ گلابی
وُہ دولتِ حُسن کا دفینہ

وہ جسکا اُبھار تھا دل آویز
فتنہ انگیز و ولولہ خیز

سانچے میں ڈھلا ہوا بدن تھا
سج دھج میں عجیب بانکپن تھا

موزونیت لباس کا راز
تجھ کو بھی ملا تھا اک خوش انداز

اب کیا ہوئی وہ بہار محفل
کیوں اُٹھ گئی جان نثارِ محفل

چہرہ پہ ہیں یاس کے سے آثار
آنکھیں ہیں مرے سو سخت بیزار

رخسار سفید و مضمحل ہیں
لب خشک گواہِ سوزِ دل ہیں

رعنائی تھی جس کمر کو دم سے
جھکنے لگی وہ بھی بارِ غم سے

اندازِ روش بتا رہا ہے
جبرًا کوئی اب چلا رہا ہے

نظروں میں ہے تلاش و بیقراری
کچھ یاس تو کچھ امید داری

ممکن ہے ضرورتیں نکل جائیں
یہ کام بھی چند روز چل جائیں

صنعت میں کہاں وہ قدرتی رنگ
انسان کی عقل ہے یہاں دنگ

اوقات مقررہ ہیں سب کے
ہم سب ہیں مطیع حکم رب کے

جو آج نیا ہے کل پرانا
اس بات کو جانتا ہے دانا

مغرور نہیں شباب پر وہ
نازاں نہیں خیال و خواب پر وہ

احساس فنا ہے اس کو حاصل
تھوڑی سی خوشی میں کب ہو غافل

تو خوابِ گراں سے چونک جاتا
وہ قیمتی وقت کیوں گنواتا

شادی و الم میں [illegible]
دل میں ترے اعتدال رکھتا

صادق کو نہ بوالہوس سمجھتا
بوالحرص کو ہم نفس نہ رکھتا

سچوں پہ کیا نہ کچھ سہارا
جھوٹوں کی چمک نے تجھ کو مارا

برباد ہوا وہ کارخانہ
وہ حسن و شباب کا زمانہ

نازک سی کمر لچکنے والی
موزون صورت صفت نرالی

میٹھی باتیں تبسم آمیز
مستانہ روی قیامت انگیز

مشہور تھی تیری جامہ زیبی
بے مثل تھی تیری دلفریبی

پیشانی پہ کیوں غبارِ غم ہے
کیا فکر ہے کس کا یہ الم ہے

آلودہ گرد ریشمیں بال
پلکیں نمناک شاہدِ حال

آنکھوں سے عیاں ہیں ضعف و حسرت
سینہ غماز جوش رقت

رفتار سے بے بسی ہے ظاہر
ہستی پہ نہیں غریب قادر

گفتار میں بیدلی کے آثار
باقی نہیں فرق یار و اغیار

قدرت جسے اب مٹا رہی ہے
صنعت اُسے کچھ چھپا رہی ہے

آخر کو فنا فنا ہے غافل
صنعت سے بنا ہے کون کامل

قدرت کے ہیں قاعدے نرالے
ٹلتے نہیں یہ نہ ٹلنے والے

تخلیق و فنا سدا ہیں جاری
ہر وقت یہ حالتیں ہیں طاری

یکساں ہے اُسے شباب و پیری
ہموزن امیری و فقیری

ہے وقت کی قدر اُس کے دل میں
ہے عجز سرشتِ آب و گل میں

تجھ کو بھی خبر اگر یہ ہوتی
(اے کاش تجھے نظر یہ ہوتی)

کچھ فرق بُرے بھلے میں ہوتا
آغوشِ عدو میں تو نہ ہوتا

گوہر کی بجائے سنگ خارا
ہوتا تجھے کس طرح گوارا

سچوں کی تجھے تلاش ہوتی
تو ڈوب کے لاتا کوئی موتی

قدرت نے وہ طلسم توڑا
نقشِ باطل مٹا کے چھوڑا

اے دامِ ہوا میں پھنسنے والو
انجام جہاں پہ ہنسنے والو

دنیا کے چمن کے نونہالو
تھوڑی سی فکر بہکنے والو

قانونِ خدا جو توڑتے ہیں
جو صدق سے منہ کو موڑتے ہیں

مرتے ہیں وہ ایڑیاں رگڑ کر
پاتے ہیں سزا یہ سخت مر کر

دنیا کی حیاتِ کامرانی
لاتی ہے عذاب آسمانی

جس پر پڑی جلا کے چھوڑا
سب نام و نشاں مٹا کے چھوڑا

اس میں نہیں نورِ آسمانی
جس سے ہو سرورِ جاودانی

جو کچھ ہے وہ آرزو اسی سے

اے غافلو بھول کر نہ سونا
انجام سے بے خبر نہ ہونا

غافل نہیں حق کا کارخانہ
دیتا ہے سزا اُنہیں زمانہ

قائم نہیں رنج و شادمانی
عبرت کی جگہ ہے دارِ فانی

دُنیا کا ہے پھل غرور و نخوت
انجام ہے آسماں کی لعنت

اے کم نظرو خدا کو مانو
دُنیا کو طلسمِ تیرہ جانو

اللہ ہے نُورِ جزو کل کا
خالق ہے وہی ہر ایک گُل کا

گوہر کی ہے آبرو اسی سے

تازہ غزلیں

نہ بیخوابی نہ بدخوابی کوئی تربت کے سونے میں
عجب آرام سے چپکے پڑے ہیں ایک کونے میں

وہ ایسا کون ہے ڈالے ہلاکت میں جو دل اپنا
میں خود روتا نہیں ناصح مزا ملتا ہے رونے میں

جہاں چاہو میسر ہے نہ میلا ہو نہ بوسیدہ
خدا نے کیا شرف رکھا ہے مٹی کے بچھونے میں

ترے عاشق کو راحت مل چکی اے وائے ناکامی
شبیں کٹتی ہیں بے تابی میں دن کٹتے ہیں رونے میں

خزاں نے کیسے کیسے نخل کو پامال کر ڈالا
مشقت باغباں نے کسقدر کھینچی تھی بونے میں

تلاشِ دل تو اے ناصح بھلا اک امر آخر ہے
مجھے ہے گفتگو کمبخت کے ہونے نہ ہونے میں

کہاں پھینکا ہے لا کر رُوح نے اس جسمِ خاکی کو
یہی ہوتا ہے طاقت سے زیادہ بوجھ ڈھونے میں

دُرِ مضموں کو ہر اِک گوندھ لے اے شادؔ مشکل ہے
سلیقہ انتہا کا چاہیئے موتی پرونے میں

شادؔ عظیم آبادی

جستجو میں اس کی وحشت کا چلن ثابت ہوا
بہکی باتوں سے مرا دیوانہ پن ثابت ہوا

آج تک وعدے پہ جس کی تھا مدارِ زندگی
وائے محرومی وہی پیماں شکن ثابت ہوا

حور کا دلدادہ نکلا زاہدِ صورت پرست
شیخ سمجھے تھے جسے وہ برہمن ثابت ہوا

بن گیا سینے پہ جب داغ تو لا آفتاب
صبح مرقد کا سپیدہ ہے کفن ثابت ہوا

دشت کے دامن میں وہ گل ہیں جو گلشن میں نہ تھے
عشقِ روئے یار میں صحرا چمن ثابت ہوا

کھل گیا راز کمر بندھنے سے میرے قتل پر
وصل کا انکار کرنے سے دہن ثابت ہوا

عازمِ ملکِ بقا ہوتے ہی بدلا روح نے
قالبِ خاکی پرانا پیرہن ثابت ہوا

تیر میں دل کو متاعِ دہر تھے وجہِ خلش
خارِ دامن گیر ہر تارِ کفن ثابت ہوا

پہنچی از خود رفتگی تک نوبتِ سرگشتگی
راہِ الفت میں سفر اندر وطن ثابت ہوا

عیش کا انجام غم ٹھہرا سرائے دہر میں
غور کرنے سے یہ گھر دارِ محن ثابت ہوا

یاد لب میں جانِ شیریں کا دمِ غم لے چکے
رشک لیلےٰ تیرا مجنوں کوہکن ثابت ہوا

اے پری شق القمر کا کیوں جہاں قائل نہ ہو
چاند کا ٹکڑا ترا گورا بدن ثابت ہوا

ہے غبارِ عاشقانِ چشم سے دشت عیاں
جو بگولا دشت سے اٹھا ہرن ثابت ہوا

شام سے تا صبح عشقِ زلف و عارض میں جلا
تیرا پروانہ بھی شمعِ انجمن ثابت ہوا

جمع ہوتے جاتے ہیں اہلِ سخن یاں بھی حبیبؔ
قدرداں اس فن کے ہیں شاہِ دکن ثابت ہوا

تصحیح :- ماہ گذشتہ کے پرچے میں صفحہ (۳۰) پر میر نیرنگ صاحب کی غزل کے مقطع کے دوسرے مصرعے کو اس طرح پڑھیے "ترے کوچے کے گلشن سے کوئی کیوں جائے زنداں کو"

کس طرح اُس بشر سے کسی کو ضرر نہ ہو
بندہ تو بندہ جس کو خدا کا بھی ڈر نہ ہو

وہ اور اُن کی غنچہ و گل پر نظر نہ ہو
ڈرتے ہیں وہ کہ خندۂ زخمِ جگر نہ ہو

دم بھر وہ میری آنکھ سے اوجھل اگر نہ ہو
اتنی خبر ہی مجھ کو کہ پھر کچھ خبر نہ ہو

اُونچی نظر ہوئی ہے تو نیچی نظر نہ ہو
کس کام کا وہ تبر کہ جو کارگر نہ ہو

وُہ خود ہیں بیقرار لگی کے لگاؤ سے
یہ بھی ہے کوئی بات اِدھر ہو اُدھر نہ ہو

ڈرتا ہوں دیکھتا نہیں ابرو کو اس لیئے
چتون تری چڑھائے ہُوئے باڑ پر نہ ہو

مانا کہ دیکھنے سے بھی جیتا ہے آدمی
وہ کیا کرے جسے ترے در تک گذر نہ ہو

سینے سے ڈھل رہا ہے دوپٹّہ جو بار بار
ہے رشک مجھ کو دستِ نسیمِ سحر نہ ہو

وہ چاک چاک ہے تو یہ صد زخم زخم ہے
ممکن نہیں کہ دل کے برابر جگر نہ ہو

قدغن کیا ہے جوششِ رنگِ بہار نے
دو دن کے بعد پھول کی مٹھی میں زر نہ ہو

دل کی سی جو کہنی کسی ایسے کو نہ چاہیئے
انسان ہو خدا کے لیئے جانور نہ ہو

طاقت نہیں ہے ضبط کی، مرجائینگے غریب
اے آہ ابتو نشترِ زخمِ جگر نہ ہو

ناصح کسی کی آنکھ جو کہہ جائے بزم میں
تیرے فرشتے خاں کو بھی اس کی خبر نہ ہو

کیا کیا تڑپ تڑپ کے نہ مانگی دعائے وصل
تقدیر کی ہے بات مری جان ورنہ ہو

شاعر کسی کا قصۂ غم کیا سُنو گے تم؟
جاؤ بھی اپنا کام کرو مرے سر نہ ہو

آغا شاعر دہلوی قزلباش

رند کے حال سے اب شیخ خبردار نہیں
کون ہے جو تجھے دل دیکھے گنہگار نہیں

گرمیِ سوزشِ دل مرگ سے ناچار نہیں
نالۂ مرغِ گرفتار گرفتار نہیں

بگرانمائیِ خویش و بکم ظرفیِ دہر — ہم ہیں وہ جنس کوئی جسکا خریدار نہیں!

حسن! یہ تیرے کرشمے ہیں کہ باہمہ شوق — طاقتِ دید نہیں قوّتِ گفتار نہیں

سیرِ طوفانِ حوادث نہیں کارِ آساں — بخت پر اپنے ہیں نازاں ہو کہ بیدار نہیں

چاہتے ہو کہ میں پھر کھاؤں فریبِ غمزہ — لب پہ اقرار کہاں ہے اگر انکار نہیں؟

کچھ اگر ہے تو ہے دلجوئی دشمن کا گلہ — ورنہ کچھ شکوہ بیمہریِ دلدار نہیں

اثرِ عشوہ سے تیرے ہے عجب حال مرا — شکوہ لب پر ہے مگر جرأتِ اظہار نہیں

درک وادراک کی ہے ہم کو حقیقت معلوم — کچھ وہی لوگ ہیں ہشیار جو ہشیار نہیں

آنکھ کھلتی ہے دورنگیِ جہاں سے سب کی — ورنہ یاں کس کو تمنّا سے سروکار نہیں

ریختے میں ہے مرے رنگِ ظہوری وحشت
ہر کوئی جسکو سمجھ لے یہ وہ اشعار نہیں

رضا علی وحشت (از کلکتہ)

باتوں پہ دل جلوں کی نہ آئے جان جائیے — بس ہو چکی بہت خفگی - مان جائیے

صدقہ ان انکھڑیوں کا ادھر بھی نگاہِ ناز — ہم وہ ہی آشنا تو ہیں پہچان جائیے

بیفائدہ ہے حضرتِ ناصح یہ قیل و قال ق — بندہ نواز بہرِ خدا مان جائیے

سیرت وہ دلپسند کہ دل کیجئے نثار — صورت وہ دلفریب کہ قربان جائیے

اچھا قصوروار جو اب کچھ گلہ کروں — پامال کیجئے مرے ارمان جائیے

سیری تو کچھ نہیں ہوئی دیدار سے مگر — اللہ کے سپرد مری جان جائیے

جھگڑے یہ حسن و عشق کے سب چھوڑیئے رضا — کسبِ کمال کیجئے - جاپان جائیے

رضا

عرق ماء اللحم انگوری دو آتشہ

جس میں انگور - بہی - سیب اور ایک جڑی بوٹی مولّد و مصفّی خون اور بہی
دواؤں کا ست اور شیر - بھیڑ - بکری کے گوشتوں کا جوہر کشید کر کے شامل
کیا گیا ہے دوا اور غذا کا کام دیتا ہے - سال میں ایک دفعہ ایک ماہ تک
استعمال بطور علاج حفظ ما تقدم کیا جائے تو پھر کوئی مرض جسم میں
داخل نہیں ہو سکتا اور نہ کوئی قوت گھٹ سکتی ہے اور جو بہ سبب تبدیلات موسم
کے باعث ہوا ان سب کا جسم پر بڑا اثر ہوتا ہے جیسے وبائی عوارض ملیریا
ہیضہ - طاعون وغیرہ کے اجسام جان انسان کے دشمن ہیں - کیونکہ خون کے
سرخ کیڑے جو قدرت نے بیرونی دشمنوں کے حملہ سے محفوظ رکھنے کے لئے ایک
چھلنی یا جال کی صورت میں پیدا کئے ہیں (خون کو باریک بین سے دیکھو
یا درہ کو بوش دیکر دیکھو تو ایک جزو ضرور نظر آئیگی) یہ بیرونی تمام
دشمنوں کو قید کر کے مارنے کی خدا کی تدبیر ہے +

علم افعال الاعضاء سے ثابت ہو سکتا ہے کہ یہ ذرات خون جب تک بمقدار کثیر خون
میں ہوں تم میں کوئی مرض جسم میں پیدا نہیں ہو سکتا - اگر وہ دانے سرخ خون
میں کم ہوں تو بخار - سعال اور وبائی امراض پیدا ہو جاتے ہیں اور کمزوری
اور اعضائے رئیسہ کے بگاڑ ان کی کمی سے شروع ہوتے ہیں +

اس عرق ماء اللحم کے پینے سے خون کا مقدار جسم انسان
میں بڑھ جاتا ہے جس سے تمام اعضائے رئیسہ خوشحال اور اپنے افعال کو
باقاعدہ کرنے میں مجبور ہو جاتے ہیں (عرق شروع کرنے سے پہلے جسم کا وزن کرلو
اور ایک ماہ پینے کے بعد دیکھ لو وزن ڈیوڑھا ہو جاوے گا) اسی واسطے جو
لوگ عرق ماء اللحم کو سال بھر میں ایک دفعہ موسم سرما میں چند بوتلیں پی
لیں گیارہ ماہ صحت و سلامتی سے گزارتے ہیں - ہمارا یہ **دعویٰ** غلط نہیں
کے علاوہ صدہا لوگ جن کے نام رجسٹر میں موجود ہیں ثابت کرتے ہیں کہ وہ اسکے
ذریعہ کامیاب ہوئے - ہزاروں بوتلیں ہر سال باہر جاتی ہیں +

عرق ماء اللحم کے پینے سے چہرہ پُر نور رہتا ہے - رنگ روشن سرخ - آثار
پیری مفقود اور آثار جوانی نمودار ہوتے ہیں - بدن
میں قوت بہت - تم حوصلہ پیدا ہوتا ہے - غذا خوب ہضم ہو کر جزو
بدن بنتی چلی جاتی ہے +

عرق ماء اللحم کے پینے سے درد کمر - نزلہ - زکام - سرد کھانسی - دمہ - سانس پھولنا
خون کی خرابی - انگلیوں پر خرابی دور ہو جاتے ہیں -
کمزور - لاغر کو فربہ بنا دیتا ہے +

قیمت
ایک بوتل دو روپیہ (عہ) - ۳ بوتل (لعہ) - آدھی درجن (للعہ) درجن ...
نمات میں ۳ بوتل سے کم روانہ نہ ہوگا - ریلوے سٹیشن کا نام معہ لائن
پورا لکھیں - (مفصل کتاب صحت یا مکان اور بیچ طلب کریں +

مقوی - مسمن - مولدِ خون - مصفی خون - مقوی دماغ +

پتہ: حکیم ڈاکٹر **غلام نبی** زبدۃ الحکماء
ایڈیٹر رسالہ حافظ صحت **لاہور** (رجسٹرڈ)

ممیرا اور سچے موتیوں کا سفید سرمہ

معطیہ جناب نامی گرامی ڈاکٹر ڈبلیو آر گرایپر صاحب بہادر ایف۔ سی۔ ایس
اے۔ آر۔ ایس۔ ایم فیلو آف کمسٹری لنڈن

جس کی نسبت لندن و کلکتہ و پنجاب آگرہ میڈیکل کالج کے سند یافتہ معزز ڈاکٹروں و نوابوں و راجاؤں کے معزز حکیم لوگ و صاحبان جج بہادر و مجسٹریٹ بہادر و صاحبان ڈپٹی کلکٹران بہادر و معزز یورپین صاحبان انگریز بہادر وغیرہ نے بعد تجربہ و استعمال کے ہم کو یہ لکھا ہے کہ آپکا ممیرا و سچے موتیوں کا سفید سرمہ آنکھوں کی بیماریوں و ترقی و روشنی کے واسطے بہت مفید اور سب سے بہتر و زود اثر دوا ہے کہ جس کے سارٹیفکیٹ بوقت فرمائش آپ کی خدمت میں ہم خود بھیجدینگے۔ ملک روس وغیرہ کے معزز ڈاکٹران و حکیم آنکھوں کی بیماریوں میں اور دوا کو چھوڑ کر ہماری اس دوا کو چھوڑ کر ہماری اس دوا کو استعمال کرتے ہیں۔ ہم نے اصلی و عمدہ ممیرا بڑی تلاش سے ہندوستان کے باہر سے منگایا ہے۔

ہمارے سرمہ کا امتحان اور اس میں جلد کامیابی

نگاہ ناپ کر ہمارا سرمہ لگایے دو ہفتے میں روشنی آنکھ کی بہت بڑھ جائیگی اور آنکھ کے جملہ نقص دور ہو جاینگے (۲) عینک کی ضرورت نہیں (۳) دھند۔ ڈھلکہ۔ آنسو بہنا۔ سرخی۔ سوزش۔ کھجلی۔ آنکھ کے سامنے کا اندھیرا۔ پلکوں کے اندر کے دانے و سرخی۔ گوہانجی (۱۳) لکھنے پڑھنے سے آنکھوں کا تکان۔ دہ بہت جلد رفع کرتا ہے (۱۴) کمزور نگاہ سے سوئی میں تاگا بہت جلد پرو لیجیے۔ پڑوال۔ سبل۔ جالا۔ پھولا۔ ابتدائی موتیابند۔ ناخونہ۔ ککرے (۲۲) آنکھوں میں سرخ ڈورے پڑجانے کو (۲۳) پلکیں گرجانیوالی بیماری کو مفید ہے۔ کمزور آنکھ کو قوت دیتا ہے۔ آنکھوں کا میل اور مواد صاف کرتا ہے اور جملہ امراض سے محفوظ رکھتا ہے قیمت فی تولہ (۱۰) روپیہ۔

المشتہر:۔ رام سرن نگم۔ کانپور (اپنا نام و مقام و نام ڈاکخانہ و ضلع خوشخط لکھو ورنہ تعمیل نہوگی)

چند معززاور قابل قدر و لائق اطمینان شہادتیں

(۱) عالیجناب ڈاکٹر اے۔ وانی رورز صاحب بہادر آر۔ جی۔ ایم۔ پی۔ لنڈن۔
(۲) جناب ڈاکٹر ایچ۔ پی۔ بنرجی صاحب۔ ایل ایم ایس سرجن کلکتہ۔
(۳) جناب ڈاکٹر پی۔ این بنرجی صاحب ایل۔ ایم۔ ایس اسسٹنٹ سرجن میرٹھ۔
(۴) جناب ڈاکٹر اللہ یار خاں صاحب ایس۔ بی۔ سی۔ اسپشل اسسٹنٹ ضلع بجنور۔
(۵) جناب ڈاکٹر عبد الصمد خاں صاحب اسپشل ضلع بجنور۔
(۶) عالیجناب شمس العلماء خان بہادر جناب مولوی محمد ذکاء اللہ پروفیسر سابق میور کالج الہ آباد۔
(۷) جناب مولوی فصیح الدین احمد صاحب ڈپٹی کلکٹر بہادر اسسٹنٹ مہتمم بندوبست کانپور۔
(۸) میر حمزہ حسین صاحب بی۔ اے۔ بی۔ ایل سب جج بہادر مقام بنگلور۔
(۹) عالیجناب مولوی سید ... صاحب منصف درجہ اول ہمیر پور۔
(۱۰) عالیجناب منشی جگت لال صاحب ڈپٹی کلکٹر و مجسٹریٹ ضلع بستی
(۱۱) عالیجناب مسٹر دین بہاری صاحب ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی ایڈیشنل جج بہادر گونڈہ
(۱۲) عالیجناب مسٹر ... صاحب بی۔ اے۔ بی۔ ایل جج خفیفہ بہادر مقام کیسر۔
(۱۳) عالیجناب مسٹر شب شنکر لال صاحب مجسٹریٹ بہادر مقام منڈگیسر۔
(۱۴) عالیجناب مسٹر جی ڈاربی صاحب بہادر ڈپٹی نارتھ ویسٹ ٹیزی کانپور۔
(۱۵) عالیجناب جی ہاگ صاحب بہادر انجنیر ریلوے۔